

# صحافتی ادب اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی وسماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے ایم۔ فل (اُردو)

مقالہ نگار:

ثناء ملک



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

# صحافتی ادب اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار:

ثناء ملک

یہ مقالہ

ایم۔ فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان و ادب)



نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

## مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخط تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: صحافتی ادب اور سماج: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

پیش کار: ثناء ملک رجسٹریشن نمبر: 16/Mphil/Urd/S20

### ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر نازیہ یونس

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئیر سید نادر علی

ڈائریکٹر جنرل

تاریخ:

## اقرارنامہ

میں ثناء ملک حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے ایم۔ فل اسکالرشپ کی حیثیت سے ڈاکٹر نازیہ یونس کی زیر نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

---

ثناء ملک

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

## فہرست ابواب

| صفحہ نمبر | عنوان                                    |
|-----------|------------------------------------------|
| iii       | مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم         |
| iv        | اقرارنامہ                                |
| v         | فہرست ابواب                              |
| viii      | ABSTRACT                                 |
| x         | اظہار تشکر                               |
| ۱         | باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث |
| ۱         | الف: تمہید                               |
| ۱         | ۱۔ موضوع کا تعارف                        |
| ۲         | ۲۔ بیان مسئلہ                            |
| ۲         | ۳۔ مقاصد تحقیق                           |
| ۳         | ۴۔ تحقیقی سوالات                         |
| ۳         | ۵۔ نظری دائرہ کار                        |
| ۵         | ۶۔ تحقیقی طریقہ کار                      |
| ۶         | ۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق            |
| ۶         | ۸۔ تحدید                                 |
| ۷         | ۹۔ پس منظر کی مطالعہ                     |
| ۸         | ۱۰۔ تحقیق کی اہمیت                       |
| ۸         | ب۔ اردو کالم نگاری اور اس کی روایت       |
| ۳۰        | ج۔ مستنصر حسین تارڑ اور ان کی کالم نگاری |

۳۶ د۔ سیاسی شعور کا تعارف

۴۱ ہ۔ سماجی شعور کا تعارف

۴۵ و۔ مستنصر حسین تارڑ کے سماجی شعور کا ارتقا

۵۲ ز۔ مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی شعور کا ارتقا

۵۷ حوالہ جات

۶۰ باب دوم: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور

۶۲ معاشرتی رویے

۷۱ سماجی مسائل

۹۷ مذہب

۱۰۳ سماجی اقدار

۱۰۹ تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور کے امتیازات

۱۱۴ حوالہ جات

۱۱۸ باب سوم: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور

۱۲۱ پاکستان کے سیاسی حالات

۱۲۶ سیاست دانوں اور مقتدر اداروں کے رویے

۱۳۹ ریاستی وسائل کا بے جا استعمال

۱۴۸ پاکستان کا دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات

۱۶۰ بین الاقوامی سیاسی مسائل کا ادراک

۱۶۲ تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور کے امتیازات

۱۶۶ حوالہ جات

|     |         |
|-----|---------|
| ۱۶۹ | ماحصل   |
| ۱۷۶ | نتائج   |
| ۱۷۷ | سفارشات |
| ۱۷۸ | کتابیات |
| ۱۸۲ | ضمیمے   |

## **ABSTRACT**

This thesis undertakes a discussion on the political and social consciousness in Mustansar Hussain Tarar's columns. Mustansar Hussain Tarar is an eminent name of the literary world. He is known as a travelogue writer, novelist, and short story writer and he has a prolific oeuvre, consisting of travelogues and novels. Mustansar Hussain Tarar is a multi-talented personality. Alongside the world of letters, he has also made his mark in the field of journalism. His columns are regarded among both literary and non-literary journalism.

A column is essentially the expression of a subjective opinion and the column writer expresses their views on contemporary issues. Mustansar Hussain Tarar ranks among the best columnists in the present era. He has narrated the ups-and-downs of Pakistani society and politics in an apt manner before the world. He correctly identifies social ills in a constructive way.

The purpose of this research work is to highlight the political and social consciousness in Mustansar Hussain Tarar's novels. A lot of research already exists on Tarar's works but no research has been done as of yet on the aforementioned premise. In this aspect, this research work is unique.

This thesis is an analytical study of the political and social consciousness in Mustansar Hussain Tarar's columns. In which political and social themes have been pointed out. Content relevant to the research paradigm was first collected, organized, and then analyzed.

This thesis has been divided into three chapters. In which the first chapter covers a general and basic discussion. In this chapter, the term "column" has been defined and classified. Furthermore, the tradition of column writing in Urdu and the evolution of Mustansar Hussain Tarar's columns has been discussed.

Chapter three elaborates the detailed analysis of the political awareness found in the columns of Mustansir Hussain Tarar. All those events and attitudes are discussed that formed the basis of his political columns. His social as well as political awareness is highlighted. In chapter fourth all the results, implications and suggestion for further research in this area are included.

## اظہارِ تشکر

اللہ تعالیٰ کے خاص کرم پر اُس کا شکر ادا کرتی ہوں۔ جس نے زندگی کے تمام کٹھن راہوں میں میرا ساتھ دیا اور میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ مجھے اپنے محبوب نبی ﷺ کا امتی بنایا۔ اس خصوصی کرم پر اللہ رب العزت کی شکر گزار ہوں۔ اُس ذات نے قلم اٹھانے کی طاقت دی اور اُس نے زندگی کے باقی معاملات کی طرح تحقیقی مرحلے کو عبور کرنے کی ہمت بھی عطا کی۔ مزید برآں میں اپنے والدین بہن گڑیا، بھائیوں تو صیف احمد عباسی اور عثمان عباسی کی شکر گزار ہوں جن کے تعاون اور شفقت کے بغیر میں میرے لیے آگے بڑھنا ممکن ہی نہیں۔ اُن کی ڈانٹ نے میرے اندر حوصلے کو برقرار رکھا اور میرے کام کے دوران مجھے تھکن کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں اپنی نگران ڈاکٹر نازیہ یونس کا شکریہ ادا کرتی ہوں جن کی بہترین نگرانی اور خوش اخلاقی نے مجھے حوصلہ دیا۔ ڈاکٹر نعیم مظہر جنہوں نے فن تحقیق سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر صائمہ نذیر اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم سمیت نمل (شعبہ اردو) کے تمام اساتذہ کرام اور اس شعبے سے متعلق دیگر افراد کا بھی ممنون ہوں۔ نمل لائبریری کے عملے کا شکریہ جنہوں نے تحقیقی کام کے لیے ایک پرسکون ماحول فراہم کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کی مشکور ہوں جنہوں نے ہمیشہ مجھے قیمتی مشوروں سے نوازا اور ملاقات کے لیے وقت دیا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اور ڈاکٹر غفور شاہ قاسم جنہوں نے اپنی قیمتی آرا سے مجھے مستفید کیا اور جہاں مجھے مشکل پیش آئی، ڈاکٹر اشفاق صاحب نے میری رہنمائی کی۔ اس لیے متذکرہ شخصیات بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔

موضوع کے انتخاب میں ڈاکٹر عالم خان صاحب کی شکر گزار رہوں گی۔ جنہوں نے درست سمت کی طرف میری راہنمائی کی اور میری ہر ٹیلی فون کال کا جواب دیا۔ دوران تحقیق مواد کی تلاش و ترتیب میں معاونت کرنے پر صدام حسین کا شکریہ اور ذیشان اکبر بھائی جنہوں نے کمپوزنگ کے تمام فرائض بخوبی انجام دیے۔

Last but not least اپنے ساتھی اسکالرز سیدہ طیبہ کاظمی اور توفیق بھائی جنہوں نے ایم فل کے دوران

میں بہت ساتھ دیا اور تحقیق کے اس کٹھن مرحلے کو اپنے تعاون اور محبت سے میرے لیے آسان بنایا۔

ثناء ملک

ایم۔ فل (اردو) اسکالر

## باب اول:

# موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

## الف۔ تمہید

### ۱۔ موضوع کا تعارف (INTRODUCTION)

مجوزہ تحقیقی مقالہ ”مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی اور سماجی شعور“ پر مشتمل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا شمار عصر حاضر کے نمایاں ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف کالم نگار ہیں بلکہ انھوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف ناول، افسانہ، ڈراما اور سفرنامہ میں بھی اپنا قلم آزمایا۔

دیگر اصناف کی طرح مستنصر حسین تارڑ کا صحافت میں بھی ایک اعلیٰ مقام ہے۔ انھوں نے اب تک بے شمار کالم لکھے۔ مستنصر حسین تارڑ آج کل اخبار جہاں میں ”کارواں سرائے“ کے نام سے کالم لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ آٹھ سال تک روزنامہ مشرق لاہور میں بطور کالم نویس اپنے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ اس کے علاوہ 92 نیوز اور انگریزی اخبار ”The Dawn“ میں بھی بہت عرصہ تک کالم لکھتے رہے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے ۳۱ سفرنامے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں، جبکہ دو ناولٹ، ۲ (دو) افسانوں کے مجموعے اور تین کتابیں خاکوں اور خطوط پر مشتمل ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے ڈراموں کی تعداد سات ہے جبکہ کالموں کے تیرہ مجموعے بھی شامل اشاعت ہیں۔ اس کے علاوہ گیارہ ناول بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اب ان کا علم، فہم اور ادراک ایک محقق اور تاریخ شناس ہونے کی گواہی دیتا ہے۔

مجوزہ تحقیقی کام مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی اور سماجی شعور پر مشتمل ہے۔ ان کے کالموں کے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہوئے ان کو سیاسی اور سماجی پس منظر کے حوالے سے دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں موجود خصوصیات جو ان کو دیگر کالم نگاروں سے نمایاں کرتی ہیں۔ ان خصوصیات کو ادب کے قارئین کے سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں سماج میں ہونے والے حالات و واقعات کو علامتی انداز سے بیان کرتے ہیں۔

ان کے اکثر کالموں میں سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں مختلف سماجی برائیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور ان کی طرف معاشرے میں موجود افراد کے رویوں پر علامتی انداز میں طنز کے نشتر چلاتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں مستنصر حسین تارڑ سیاسی اور معاشرتی واقعات سے پیدا شدہ صورت حال پر بحث کرتے ہیں۔ ملکی سیاست، اداروں کی کارکردگی، سیاسی منصوبہ بندی، سیاست دانوں کے رویے اور عوامی فلاح و بہبود کے متعلق منصوبوں پر لکھتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کو سنگ میل پہلی کیشنز نے کتابی صورت میں بھی شائع کیا ہے جن کی تعداد دس کے لگ بھگ ہے۔ ان کے کالموں کے مجموعوں میں چک چک، گزارہ نہیں ہوتا، الو ہمارے بھائی ہیں، گدھے ہمارے بھائی ہیں، ہزاروں ہیں شکوے، شتر مرغ ریاست، کارواں سرائے، بے عزتی خراب اور تارڑ نامہ شامل ہیں۔

## 2۔ بیان کا مسئلہ (Statement of problem / THESIS STATEMENT)

مستنصر حسین تارڑ وہ ہمہ جہت شخصیت ہیں جنہوں نے کالم نگاری کے ذریعے اردو ادب میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں پر تاحال کسی نوعیت کا کوئی بھی تحقیقی کام سامنے نہیں آیا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے کالموں کے موضوعات کا جائزہ لیا جائے۔ مجوزہ تحقیقی کام مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں موجود سیاسی اور سماجی شعور کے عناصر کا تجزیاتی مطالعہ ہے اس مطالعہ کی بدولت مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی اور سماجی شعور کا تعین کیا گیا ہے۔

## 3۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

مجوزہ تحقیقی مقالے کے مقاصد درج ذیل ہیں:

- (1) مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ
- (2) مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی و سماجی شعور کی نوعیت کا جائزہ
- (3) مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کے امتیازات کا مطالعہ

#### 4۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

مجوزہ تحقیقی مقالے کے لیے درج ذیل سوالات کو مد نظر رکھا گیا ہے:

- (1) مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں پیش سیاسی و سماجی موضوعات کا تنوع کیسا ہے؟
- (2) مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کی نوعیت کیا ہے؟
- (3) مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کے امتیازات کیا ہیں؟

#### 5۔ نظری دائرہ کار (THEORETICAL FRAMEWORK)

کسی بھی ادیب کے شعور کی کئی جہتیں ہوتی ہیں کیونکہ شعور کی انفرادیت میں جماعتی ضرورتوں اور خواہشوں سے کافی پردے اٹھتے ہیں۔ اپنے ماحول کی مادی بنیادوں سے لے کر خوابوں کی حقیقت تک ناجانے کتنی منزلیں ہیں اور ہر منزل انسانی شعور پر اپنا نقش چھوڑتی ہے۔ کسی کے پاس بنا بنایا شعور نہیں ہوتا بلکہ رفتہ رفتہ بنتا ہے اور اگر ارد گرد کے حالات بدلیں تو بدل بھی جاتا ہے۔

اس طرح فرد کے شعور کے مطالعے میں سماج کے بدلے ہوئے مادی حالات کا مطالعہ لازمی حصہ شمار ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی اور سماجی شعور کے مطالعے میں جس چیز کو بطور خاص جاننے کی کوشش کی گئی وہ بیسویں صدی کے وسط کا وہ خطہ ارضی (جو بعد میں پاکستان کے نام سے دنیا کے نقشے پر ایک خود مختار ملک کہلایا) جس پر کئی پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جاسکتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد یہاں کے سیاسی اور سماجی حالات کچھ اس طرح کے تھے۔ مثال کے طور پر معاشی عدم مساوات، تقسیم ملک سے وابستہ امیدوں کا ٹوٹنا، تہذیبی اور تمدنی قدروں کی توڑ پھوڑ، صنعتی معاشرے کا کرب فرد کی انفرادیت اور پہچان کا مسئلہ، ہجوم میں رہنے ہوئے فرد کا احساس تنہائی، کوئی واقع نصب العین نہ ہونے کی وجہ سے اجتماعی بے مقصدیت اور بے سمتی کا کرب، مادی اور سائنسی دور کے انسان کی قدر و قیمت کے تعین کا مسئلہ سچائی اور حقیقی رشتوں میں صداقت کی تلاش اور معاشرتی ناہمواری اور ملکی امور سیاست و معیشت پر بیرونی اجارہ داری کا رد عمل، بے اعتقادی اور اخلاقی اور معاشرتی ضابطوں سے بیزاری وغیرہ۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۸ء کا

مارشل لاء، ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۱ء کے سقوط ڈھاکہ اور ۱۹۷۷ء کے مارشل لاء نے پاکستانی سماج پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ سماجی مسائل میں غربت، تعلیم، حقوق نسواں، بیروزگاری اور جرائم شامل ہیں۔

متذکرہ بالا نکات کو جب کوئی ادیب اپنے فن پاروں میں جگہ دیتا ہے تو اس سے اس کی شعور کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جیسے سیاسی حالات سے واقف ہونا سیاسی شعور اور سماج سے متعلقہ امور سے آشنا ہونا اور اُن کو اپنی تخلیقات میں شامل کرنا سماجی شعور کہلاتا ہے۔ سیاسی شعور کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی اپنی قومی انگریزی اردو لغت میں یوں رقم طراز ہیں:

”حکومت کا ایک متعین یا باقاعدہ نظام، یا انتظامی ادارہ رکھنے والا شہری حکومت اور اس کے انتظامی ادارے سے متعلق، مملکت کے معاملات یا قومی قوانین و تدابیر کے معاملات یا قومی قوانین و تدابیر میں دلچسپی رکھنے والا، کسی قوم یا مملکت یا اقوام اور مملکتوں سے متعلق ہو۔ سیاسی شعور ریاست، حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا نام ہے۔ جس کو بروئے کار لا کر انسانی حقوق کی حفاظت، عدل سیاسی صورت حال کو جاننا اور معاشی نظام کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔“

سماجی شعور کے حوالے سے اردو لغت میں تاریخی اصولوں پر سماجی شعور کی تعریف کچھ یوں لکھی ہے۔ ”سماجی شعور سے مراد سماجی حالات اور سماجی مسائل وغیرہ سے آگاہی۔“ اسی طرح Universtist stellembozen university نے سماجی شعور کی تعریف کچھ یوں کی ہے:

“Universtist stellembozen university definition of social awareness social awareness is defined societies and to be conscious of difficulties and hard ship of society”.

سماجی شعور اپنے عہد کے سماج، سیاست اور ارد گرد کے ماحول میں مسلسل وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی

سے آگاہ رہتا ہے۔ درج بالا تعریفوں اور وضاحت کو نظری مطالعات کے طور پر رکھ کر مجوزہ تحقیقی کام کیا جائے گا۔

اس کے علاوہ تحقیقی کام کے دوران پروفیسر عبد الحمید کی کتاب ”عمرانی نظریہ تحقیق“، ڈاکٹر سید حسین محمد جعفری کی تصنیف ”پاکستانی معاشرہ اور ادب“، نگینہ جبین کی کتاب ”اردو ناول کا سیاسی اور سماجی مطالعہ“، اور ”سیاسیات ارسطو“ جیسی کتب مد نظر رہیں۔ ان کتب میں مختلف ادیبوں کے مضامین اور ناقدین کی آرا شامل ہیں۔

نگینہ جبین کی کتاب میں ادب اور سماج کا تعلق، سماجی حالات اور واقعات کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انگریزی کتاب ”Human Rights and Social Justice“ جو Joseph Wronka نے لکھی اور یہ کتاب ۲۰۱۷ء میں طبع ہوئی جس میں معاشرہ، سیاسی و سماجی حقوق، انسانی عظمت، معاشرتی منصوبہ بندی، سوشل ورک جیسے موضوعات پر لکھا گیا ہے۔ مزید برآں ”سیاسیات ارسطو“ میں ارسطو کے پیش کردہ ریاست کے متعلق نظریات ہیں۔ مجوزہ تحقیق میں متذکرہ بالا کتب اور ناقدین کی سیاسی و سماجی شعور کے متعلق آرا و مباحث کو نظری مطالعات کو بنیاد بنا کر تحقیقی کام کیا گیا ہے۔

## 6۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

مجوزہ موضوع مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی اور سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ بنیادی طور پر ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ جس میں کالموں میں موجود سیاسی اور سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا۔ لہذا موضوع سے متعلق مواد کے حصول اور ترتیب کے بعد تجزیاتی طریقہ کار اختیار کیا گیا۔ اس لیے مجوزہ تحقیقی موضوع پر دستاویزی طریقہ کار اپناتے ہوئے بنیادی مآخذات کے ساتھ تاریخی اور تنقیدی کتب سے بھی استفادہ کیا گیا۔ سرکاری اور نجی جامعات سے بھی استفادہ شامل ہے۔

اس کے علاوہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلامک انٹرنیشنل یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل لائبریری اور نجی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ اکادمی ادبیات، مقتدرہ قومی زبان اور نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے اداروں سے مدد لی گئی۔ اس کے علاوہ ثانوی مآخذ میں اخبارات، رسائل، مقالہ جات، اہم ویب

سائنس بھی مد نظر رہیں۔ اس کے علاوہ آن لائن کتب خانوں اور ریختہ پر موجود مواد سے بھی مدد لی گئی۔ علاوہ ازیں انٹرویوز بھی پیش نظر رہے۔

## 7۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

مستنصر حسین تارڑ ایک ادبی شخصیت ہیں۔ اس سے پہلے ان کی ادب میں پیش کی گئی خدمات پر تحقیقی موضوع کے تحت ایسا کوئی تحقیقی و تنقیدی کام نہیں کیا گیا۔

مستنصر حسین تارڑ پر ہونے والے تحقیقی کام درج ذیل ہیں:

- (i) خالد محمود، مستنصر حسین تارڑ کے ناول میں معاشرت نگاری، مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ۲۰۱۶ء۔
- (ii) آسیہ بی بی، مستنصر حسین تارڑ کے مذہبی سفر ناموں کا فکری اور فنی جائزہ (منہ ول کعبہ شریف اور غار حرا میں ایک رات کے حوالے سے) مقالہ برائے ایم فل اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔
- (iii) تسنیم صدیق، مستنصر حسین تارڑ کی ناول نگاری، مقالہ برائے ایم فل اردو، جی۔ سی یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۲ء۔
- (iv) عبدالستار، حج نامہ کی روایت میں مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا مقام، مقالہ برائے ایم فل اردو، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور، پاکستان، ۲۰۱۰ء۔
- (v) فرحین ندیم، مستنصر حسین تارڑ کے ناول تہذیبی تناظر میں، مقالہ برائے ایم فل اردو، اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاول پور، پاکستان، ۲۰۱۰ء۔
- (vi) قراۃ العین حیدر چغتائی، تخلیقی ادب میں مستنصر حسین تارڑ کا مقدم حوالہ، سفر نامہ یا ناول، تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اردو، ۲۰۰۶ء۔

## 8- تحدید (DELIMITATION)

مجوزہ تحقیق مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعے پر مشتمل ہے، جس میں مستنصر حسین تارڑ کے صرف سیاسی و سماجی شعور کے حامل منتخب کتابی کالم شامل کیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر موضوعات کے حامل کالم اس تحقیق کے دائرہ کار سے باہر ہیں۔ مزید برآں مستنصر حسین تارڑ کی دیگر ادبی تخلیقات مجوزہ تحقیق کا حصہ نہیں۔ نیز مستنصر حسین تارڑ کے اخباری کالم بھی شامل تحقیق نہیں رہے۔

## 9- پس منظری مطالعہ (LITERATURE REVIEW)

مجوزہ موضوع پر کام کرنے کے لیے جن کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے

۱۔ مستنصر حسین تارڑ: شخصیت اور فن جو ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے لکھی اور یہ اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت اور سوانح کے علاوہ اُن کے سفر نامہ نگاری، ناول نگاری، افسانہ نگاری، کالم، خاکہ اور ڈراما نگاری شامل ہے۔

۲۔ فرزانه سید کی کتاب "نقوش ادب" جو سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب میں مختصر انداز میں مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت، اُن کے ناول سفر ناموں، کالموں اور افسانہ نگاری کے حوالے سے لکھا گیا۔

۳۔ "ماہنامہ چار سو" ایک شمارہ توسید ضمیر جعفری کی صدارت میں راولپنڈی سے مارچ ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا۔ جس میں مستنصر حسین تارڑ کی شخصیت اور ان کی تخلیقات پر مختلف اشخاص کی جانب سے مضامین شامل ہیں۔

۴۔ افتخار کھوکھر کی کتاب "تاریخ صحافت" جو ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں صحافت کے معنی و مفہام کا ذکر کیا گیا۔ اس کے علاوہ اردو کالم نگاری کا آغاز اور ارتقا اردو کالم کی اقسام اور مختلف کالم نگاروں کے بارے میں تفصیلات بیان کی ہے۔

۵۔ افضال بٹ کی کتاب اردو ناول میں سماجی شعور میں سماجی شعور کی تعریف اور سماج اور سماج میں موجود مسائل اور ان کی طرف لوگوں کے رویہ جات کا ذکر کر لیا گیا۔

۶۔ جمیل جالبی کی مرتب کردہ لغت "قومی انگریزی اردو لغت" جس میں سیاسی اور سماجی شعور کے معانی و مفہام اور ان کی تعریف پیش کی گئی۔

## 10۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY)

مستنصر حسین تارڑ ایک معروف نثر نگار ہیں۔ اس لیے اُن کی ادبی خدمات پر کام ہو چکا ہے اور کئی مقالے تحریر کئے جا چکے ہیں لیکن ان کے کالموں میں سیاسی اور سماجی شعور کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں کیا جاسکا۔ چونکہ کالم نگاری میں سیاسی اور سماجی شعور کو کافی اہمیت حاصل ہے اور مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی اور سماجی شعور کی عکاسی کی گئی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کالموں میں مختلف النوع سیاسی اور سماجی مسائل کو جگہ دی ہے۔ اُن کے کالم پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کالموں میں مختلف موضوعات کے ذریعے حقیقی زندگی کو سامنے لایا ہے۔ اس اعتبار سے مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان کو ادبی دنیا کے سامنے لایا جاسکے۔ اس حوالے سے مجوزہ تحقیقی کام منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

## ب۔ اردو کالم نگاری اور اس کی روایت

صحافت کے دائرہ کار میں پروڈکشن کے لحاظ سے اخبارات، ٹیلی ویژن اور ریڈیو کے کچھ پروگرام شامل ہیں۔ کام کی نوعیت سے خبروں کو اکٹھا کرنا اور اُن کو ترتیب دینا اور پھر اُس ترتیب سے خبروں کو لکھنا صحافت میں شامل ہے۔ دوسری طرف علمی، سائنسی، ادبی اور ہر طرح کے پیشہ ورانہ رسائل کی ترمیم اور ترتیب اور پھر اُن کی اشاعت کا کام صحافتی کام ہے۔ حالات حاضرہ سے متعلق تخلیق ہونے والے مضامین خبریں اور موجودہ حالات پر ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے شائع ہونے والے پروگرام صحافت میں شامل جانے جاتے ہیں۔ صحافتی اصناف میں کالم، خبر، مضامین، مراسلہ، ادارہ، مکتوب کارٹون ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صحافت کی تعریف یوں لکھتے ہیں:

"صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے۔ صحیفہ کے لغوی معنی ہیں کتاب یا رسالہ، ایک عرصہ

دراز سے صحیفہ سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقرر وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے۔

چنانچہ تمام اخبار اور رسائل صحیفے ہیں۔"<sup>(۱)</sup>

جو لوگ اس پیشے سے جڑے ہوتے ہیں انھیں صحافی کہتے ہیں اور اس پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا۔ صحافت کا مترادف لفظ جو انگریزی زبان سے ہے وہ لفظ Journalism ہے یہ لفظ جرئل سے بنا ہے اور جرئل کے لغوی معنی روزانہ حساب کا کھاتہ یا روزنامہ کے ہیں۔ جب سے صحافت کا آغاز ہوا اس لفظ کو مقررہ وقت پر شائع ہونے والا اخبار یا رسالے کے لیے استعمال میں لایا جانے لگا اور جو جرئل کو ترتیب دینے والے تھے اُن لوگوں کے لیے جرئلسٹ کی اصطلاح نافذ ہو گئی۔ اور پھر اس پیشے کو بھی جرئلزم کا نام دے دیا گیا۔ صحافت کے ساتھ ساتھ لفظ ابلاغیات بھی استعمال ہوتا ہے۔ صحافت کی ذمہ داریوں میں سے اہم ذمہ داری کسی بھی معاشرے کے افراد کو وہاں کے حالات اور واقعات سے باخبر رکھنا ہے اور وہاں کے حکومتی معاملات، تجارت، اُن کی تہذیب و ثقافت، مذہب کے بارے میں معلومات دینا۔ ان سب کے متعلق معلومات کو پوری ایمان داری اور سچائی سے دوسروں تک پہنچانا۔ کتاب تاریخ صحافت میں صحافت کے بابت یوں وضاحت ملتی ہے۔

"صحافت معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ ذہانت بصیرت اور رسائی سے ایسے انداز میں پہنچانے کا نام ہے جس میں سچ کی بالادستی ہو۔" (۲)

صحافت کا معاشرے پر اثر ہوتا ہے اور معاشرہ صحافت پر اثر انداز ہوتا ہے صحافت اور معاشرے کا چولی دامن جیسا تعلق ہے۔ ترقی کے اس دور میں صحافت ایک کاروبار کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور ایک عظیم مشن کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور سچ یہ ہے کہ ان دونوں عناصر کی یکجائی کے بغیر صحافت کا تصور ممکن نظر نہیں آتا۔ یہ بات بھی درست مانی جاتی ہے کہ صحافت ایک عظیم مشن ہے، اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو تازہ خبروں سے باخبر رکھا جائے۔ موجودہ دور میں پیش آنے والے واقعات کی درست انداز میں تشریح کی جائے اور اُن واقعات کا پس منظر واضح کیا جائے تاکہ عوام کی رائے کی تشکیل کا راستہ صاف ہو۔

صحافت عوام کی رائے کی عکاسی کرتی ہے اور اس کی ترجمان کی حیثیت بھی رکھتی ہے عوام کی خدمت اس کا فرض ہے۔ اسی وجہ سے صحافت کسی بھی معاشرے میں ایک اہم ادارے کی حیثیت لیے ہوئے ہوتی ہے۔ دوسری طرف صحافت کے کاروباری پہلو پر بات کی جائے تو یہ بات درست ہے کہ ماضی میں ایسے اخبارات شائع ہوتے رہیں جن کا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی خاص زاویہ نگاہ کے حق میں رائے عامہ پیدا کریں۔ اس کا مقصد صرف نفع کمانا نہیں بلکہ صرف مقصد کو فروغ دینا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک طرح کا کاروبار ہوتا ہے۔ جب اُس اخبار کے اتنے

گا ہگ نہیں ہوتے وہ خسارے میں چلی جاتی ہے پھر اُس کے مالک کو خسارہ پورا کرنے کے لیے کسی ادارے یا شخص کا سہارا لینا پڑتا ہے یا اُس اخبار کو بند کر دیا جاتا ہے۔ بیرونی سہارے خواہ بڑے ہوں یا کسی نیک مقصد کے لیے ہوں وہ اُس اخبار کے لیے فخر کا باعث نہیں بنتے کیونکہ جہاں پر کسی کی محتاجی ہو وہاں آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام آزادی صحافت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"آزادی صحافت کی بنیادیں معاشی آزادی پر استوار ہوتی ہیں صرف وہی اخبار آزاد رہ سکتا ہے جو معاشی طور پر کسی کا محتاج نہ ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے کاروباری بنیادوں پر چلایا جائے اور کاروباری بنیادوں پر چلانے کا تقاضا ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ گاہکوں کے لیے قابل قبول بنایا جائے گاہک زیادہ ہوں گے اخبار کو زیادہ اشتہار ملیں گے جس سے آمدنی زیادہ ہوگی اور اس آمدنی سے اخبار کو اور بہتر بنایا جائے گا۔" (۳)

کاروبار کا ایک پہلو یہ بھی ہے جس کے بارے میں شک کا اظہار پایا جاتا ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب اخبارات میں اشاعتیں بڑھانے کے لیے دوڑ کا بازار گرم ہوتا ہے تو مخالف اخبارات کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ عوام کے سستے ذوق کی تسکین کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جائیں۔ جس کی وجہ سے صحافت کا معیار گر جاتا ہے اور افراد کے اذہان آلودہ ہوتے ہیں۔ عارضی طور پر افراد اس پھانسنے میں آتے ہیں لیکن وہ صحت مند اقدار کو ہی پسند کرتے ہیں۔ ہر معاشرے میں صحافت کے اصول موجود ہوتے ہیں۔ ہر ملک کی اخباری تنظیموں نے ضابطہ اخلاق بنا رکھے ہیں تاکہ وہ اس قسم کے رجحانات میں اُن کی روک تھام کر سکیں۔ آج کل سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور نئی ایجادات روز کا معمول بن رہی ہیں اس کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبہ ہائے جات میں بہت تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔

تیزی کے اس دور میں صحافت میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔ کل تک حکمرانوں کو بادشاہوں کو ملک کے حالات سے باخبر رکھنے کے لیے ہر کاروں کا انتظام کیا جاتا تھا لیکن اُن کی خبروں سے صرف اہل اقتدار ہی مستفید ہو سکتے تھے۔ لیکن آج کل کے اس دور میں حالات و واقعات کے متعلق خبر تک امیر و غریب رسائی آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ دور حاضر میں صحافت مختلف اشکال میں سامنے آتی ہے۔ محمد افتخار کھوکھر صحافت کی جہات کی تقسیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"موجودہ دور میں صحافت کی کئی جہتیں ہیں لیکن اسے دو واضح حیثیتوں میں تقسیم کیا جاسکتا

ہے۔ ۱۔ مطبوعہ صحافت (Printed Journalism) ۲۔ برقی صحافت

(Electronic Journalism)"<sup>(۴)</sup>

مطبوعہ صحافت میں اخبارات، علمی و ادبی مجلے رسالے جراند روزنامے پوسٹرز کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ مطبوعہ صحافت میں اخبارات کو بہت اہمیت ملی ہے۔ پوری دنیا میں مختلف زبانوں میں ہزاروں اخبارات کی روزانہ اشاعت ہوتی ہے کسی بھی ملک کے قومی سطح پر شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل دنیا بھر کے واقعات اپنے اندر لیے ہوتے ہیں۔ اس سے دنیا کے مختلف کونوں میں بسنے والے افراد اب ایک خاندان کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ برقی صحافت میں سب سے زیادہ ریڈیو کو آج بھی اہمیت حاصل ہے یہ انیسویں صدی کی بڑی ایجاد ہے یہ سستا اور موثر ترین ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ بیسویں صدی کی ایجادات میں ٹیلی ویژن موثر ترین ایجاد ہے۔ اس کے ذریعے دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات کو سننے کے ساتھ ساتھ دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ برقی صحافت نے بیسویں صدی میں حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اس ترقی کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کالم بنیادی طور پر صحافتی سخن ہے اور اس کا تعلق مطبوعہ صحافت سے ہے۔ جدید صحافت میں کالم کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ہر صحافی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے کسی اخبار میں لکھنے کا موقع ملے تاکہ وہ مسائل کے متعلق اپنا نقطہ نظر اپنے قارئین کے سامنے پیش کر سکے۔

ایک کالم نگار معاشرے میں کسی بھی پہلو کو اپنی کالم نگاری کا موضوع بنا سکتا ہے۔ سیاست، تاریخ، سائنس، مذہب، نفسیات، تعلیم عرض یہ کہ معاشرے میں پیش آنے والے واقعات جس طرح کالم نگار پر اپنا اثر چھوڑتے ہیں وہ اس اثر کو اپنے الفاظ میں سمو کر انہیں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے۔ موجود دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اس جدید دور میں بھی پرنٹ میڈیا کی افادت کم نہیں ہوتی۔ اس دور میں بھی کالم نگاری ہر دل عزیز اور ایک موثر صنف سمجھی جاتی ہے۔ صحافت میں کالم کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کیونکہ اس کے بغیر اخبار کی تکمیل ممکن نہیں سمجھی جاتی۔ ایسے حالات میں جب اخباروں کو سنسر شپ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تب ایک کالم نگار اپنے مخصوص اسلوب اور علامتی طرز تحریر اپناتے ہوئے حالات و واقعات کی بہترین عکاسی کرتا ہے اور قارئین تک تحریریں پہنچاتا ہے۔

## کالم کا لغوی و لفظی معنی و مفہوم

کالم کے حوالے سے مختلف لغات اور اس سے منسلک لوگوں نے اپنے اپنے انداز سے اس کی تعریف پیش کی ہے۔ کالم لفظ انگریزی زبان سے تعلق رکھتا ہے جس کا مطلب کھمبا، قطار یا فوج کے دستے کے ہیں۔ لاطینی زبان کا لفظ Columna اور فرانسیسی زبان سے تعلق رکھنے والا لفظ colonne کو بھی کالم سے ملنے جلتے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اخبارات میں صفحوں کے تقسیم شدہ حصے کو بھی کالم کا نام دیا جاتا ہے۔ کشاف تنقیدی اصطلاحات میں کالم کی تعریف کچھ اس طرح درج ہے:

"طبع شدہ مواد کے دو یا اس سے زیادہ عمودی خانوں میں سے ایک۔ کالموں کو لکیر دار خط یا خالی جگہ چھوڑ کے الگ الگ دکھانے کے ہیں۔ مثلاً اخبار یا کسی کتاب کے کالم دار صفحے۔" (۵)

علمی اردو لغت کے مطابق: "(Column) صفحے کا حصہ، خصوصاً اخبار کا خانہ، فوج کا دستہ۔" (۶)

English to English and Urdu Dictionary کالم کے مندرجہ ذیل معانی بتاتی ہے:

۱۔ Column sporting pillar

۲۔ مینار

۳۔ جہازوں کی لمبی قطار

۴۔ فوج کا پہرا

۵۔ لاٹ" (۷)

اسی طرح ڈاکٹر شفیق جالندھری نے کالم کی تعریف یوں کی ہے:

"کالم شخصی رنگ لیے ہوئے اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والی وہ مستقل تحریریں ہیں جن کو لکھنے والے کے نام کے ساتھ مخصوص جگہ سے باقاعدگی سے شائع کیا جاتا ہے۔ کالم نویس اکثر کالم کے ساتھ اپنا نام دیتے ہیں لیکن بعض اوقات اصل کی بجائے ان کا فرضی نام بھی دیا جاتا ہے۔" (۸)

سرفراز شاہد نے لکھا ہے: "کالم بنیادی طور پر ایک صحافتی صنف ہے اور یہ اخبارات کی ضرورت کے لیے لکھے جاتے ہیں۔" (۹) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کالم کی تعریف اس انداز سے کرتے ہیں:

"ہر اخبار میں کچھ مستقل عنوان ہوتے ہیں۔ بعض کے تحت خبریں، اعلانات یا معلومات پیش کی جاتی ہیں اور بعض کے تحت مزاحیہ، نیم مزاحیہ، دینی، طبی، سائنسی اور پس منظری مواد دیا جاتا ہے۔ موخر الذکر مستقل عنوانات کو صحافتی اصطلاح میں کالم یا خصوصی کالم کہتے ہیں۔" (۱۰)

کالم لکھنے والے کو کالم نویس یا کالم نگار کا نام دیا جاتا ہے۔ اس میں شخصی رنگ زیادہ نظر آتا ہے۔ کالم نگار کی تحریروں میں اُس کی ذات نمایاں ہوتی ہے۔ کالم نگار زندگی کی حقیقتوں کو سیدھے سادے اور عام الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ کالم کی ان تعریفوں کی روشنی میں کچھ اہم نکات اخذ کیے جاسکتے ہیں جو کالم کے معانی و مفہوم کی وضاحت میں مدد دے سکتے ہیں۔

۱۔ کالم کسی بھی اخبار میں ایک مستقل لکھی جانے والی تحریر کا نام ہے۔

۲۔ کالم کا اسلوب عام فہم اور شگفتہ ہوتا ہے۔

۳۔ کالم میں معاشرے سے تعلق رکھنے والے ہر پہلو کو موضوع بنایا جاسکتا ہے۔

۴۔ کالم نگار اپنے اصلی یا فرضی نام کے ساتھ کالم لکھتا ہے۔

۵۔ اخبارات اور رسائل میں کالم کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔

کالم نویسی سے شخصی صحافت ایک نئے روپ میں سامنے آئی۔ آج سے کوئی چالیس سال پہلے پوری صحافت شخصی صحافت تھی۔ اخبار اپنے ایڈیٹر اور اپنے مالک کے نام سے چلتا تھا اس لیے اخبار پر ایڈیٹر کی شخصیت کی گہری چھاپ نظر آتی تھی۔ جب صحافت کے میدان میں ترقی ہوئی اور اس میں وسعت آگئی۔ اس کے مختلف پہلوؤں نے ترقی پائی تب ایڈیٹر کی شخصیت کا اثر کم ہونے لگا اخبار کے نظام میں بھی وسعت آنے شروع ہو گئی اس دور میں کالم نویسی شخصی صحافت کے طور پر ایک نئے انداز میں نمودار ہوئی اور یہ انداز آج تک مروج ہے کیونکہ لوگ صرف فیچر، ادارے خبریں نہیں چاہتے بلکہ اُن کی یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ کسی اخبار میں چند لوگ اُس سے انفرادی طور پر براہ راست مخاطب ہوں۔

## کالم کی اقسام

اخبارات میں بے شمار کالم شائع ہوتے ہیں۔ موضوع، اسلوب اور دیگر حوالوں سے کالم کو مختلف اقسام میں تقسیم کرنا ممکن نہیں کیونکہ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہر کالم لکھنے والے کا اپنا مقرر اسلوب ہوتا ہے اور اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کالم نگار مختلف موضوعات پر اظہار خیال کرتا ہے تو اُن کے کالموں کو کالم کی کسی قسم میں درجہ بندی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کالموں کے اسلوب بیان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ایک امریکی صحافی ولیم ایل مہکار کے مطابق:

"کالم کی اقسام نہیں بنائی جاسکتیں۔ مختلف کالموں کا اسلوب ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوتا ہے اور موضوع اور مواد کے لحاظ سے بھی ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں ہوتی۔" (۱۱)

ماہرین صحافت کے خیال میں چونکہ کالم نویسی کا کوئی طریقہ متعین نہیں ہے اور نا ہی اس کا کوئی متعین اسلوب ہے۔ اس لیے ایک کالم نویس کے مختلف کالموں کو مختلف اقسام میں درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کالم کی تقسیم کا تعین نہیں کیا گیا۔ کالم کی تین حوالوں سے تقسیم کی گئی۔

۱۔ اسلوب

۲۔ موضوع

۳۔ مشاہدہ

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید فن صحافت میں کالموں کی درج ذیل اقسام بتائے ہیں: "۱۔ طبی کالم ۲۔ قانونی

کالم ۳۔ دینی کالم ۴۔ مزاحیہ کالم" (۱۲) ڈاکٹر شفیق جالندھری کے مطابق:

۱۔ ذاتی ادارہ نما کالم

۲۔ فکاہی یا مزاحیہ کالم

۳۔ تخصیصی کالم

۴۔ ذاتی ڈائری نما کالم

۵۔ شہر نام کالم" (۱۳)

صابر علی سہوانی کے مطابق کالم کی درجہ ذیل اقسام ہیں:

"۱۔ رنگ برنگ کالم ۲۔ ذاتی کالم ۳۔ مزاحیہ کالم ۴۔ سنڈیکٹ کالم" (۱۴)

## الف۔ فکاہیہ / مزاحیہ کالم

فکاہیہ کالم ایسے کالم ہیں جن میں اخبار کا مطالعہ کرنے والوں کی تفریح طبع کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ فکاہیہ کالم میں طنز و مزاح کے ساتھ جملوں کو پر لطف اور دل کش بنایا جاتا ہے۔ اردو صحافت کے آغاز کے ساتھ ہی فکاہی کالم نگاری کا آغاز ہو گیا تھا۔ اس طرح کے کالموں میں سیاسی و سماجی زندگی کے مضحک پہلوؤں کو نمایاں کر کے مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ طنزیہ جملوں، فرضی کرداروں، لطائف اور الفاظ کے رد و بدل کے ذریعے سے تحریر میں مزاح پیدا کیا جاتا ہے۔ قارئین کے خطوط کو بھی کالم کا حصہ بنایا جاتا ہے۔ محمد اسلم ڈوگر فکاہیہ کالم کی مثال میں لکھتے ہیں:

"نوائے وقت میں شائع ہونے والا پروفیسر محمد سلیم کا "سرائے" اور جنگ میں شائع ہونے والا ڈاکٹر محمد یونس بٹ کا کالم "عکس برعکس" فکاہی کالم کی مثالیں ہیں۔" (۱۵)

فکاہی کالم عموماً ایسے صحافی لکھتے ہیں جن کو زبان اور بیان پر پورا مکمل عبور حاصل ہوتا ہے۔ بعض اوقات فکاہی کالم نگار معاشرے میں موجود تلخ حقائق کو طنزیہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالم کا نمونہ ملاحظہ ہو:

"میں مستنصر حسین تارڑ بہ قائمی ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ میں ہر گز ہر گز پاگل نہیں ہوں۔ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ براہ کرم یہ زنجیریں اور بیڑیاں کھول دیں اور مجھے درخت کے ساتھ نہ باندھے۔۔۔ ڈاکٹر مسکراتا ہے اور کہتا ہے سبھی یہی کہتے ہیں۔ میں بھی مسکراتا ہوں۔ دیکھئے ڈاکٹر صاحب یہ جو کوئی بھی آپ ہیں بالکل نارمل انسان ہوں۔ مجھ میں ایک نارمل انسان کی تمام تر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ میں اپنی روزی کے لیے دن رات مشقت کرتا ہوں۔ گھریلو اخراجات اگر پورے نہیں ہوتے تو کبھی کبھار چیخ چلا لیتا ہوں۔ حالات سے تنگ آکر کبھی کبھی بالکل خاموش ہو جاتا ہوں۔ بجلی اور پانی وغیرہ کے بل زیادہ آجائیں تو کڑھتا ہوں۔ پیدل چلتے ہوئے بڑبڑاتا بھی ہوں لیکن میں پاگل نہیں۔" (۱۶)

## سنجیدہ کالم

کالم کی اس قسم میں زیادہ تر سنجیدہ موضوعات پر لکھا جاتا ہے۔ اس میں طنز و مزاح کا استعمال نہیں ہوتا۔ اپنے انداز و اسلوب کے حوالے سے ادارے کے قریب تر مانا جاتا ہے۔ مگر ان میں فرق ہے ادارہ میں جو خیالات پیش کیے جاتے ہیں ان کو اس اخبار کے خیالات مانا جاتا ہے مگر کالم میں کالم نگار کے ذاتی خیالات بھی شامل ہوتے ہیں۔ جن کے لیے ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اخبار کے خیالات سے مطابقت رکھتے ہوں۔ سنجیدہ اسلوب کے حامل کالم نگاروں کے مطالعہ میں وسعت پائی جاتی ہے یا پس منظر کی سیاسی مطالعہ مضبوط ہوتا ہے۔ وہ معاملات کا تجزیہ کر کے انہیں بیان کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اخبار کے قارئین انہیں رہنمائی کے طور پر پڑھتے ہیں اور مختلف سماجی اور سیاسی واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں۔ محمد اسلم ڈوگر سنجیدہ کالم کی مثال میں لکھتے ہیں:

"زیڈ اے سلہری کا کالم" مسائل و افکار "وراث میر کا کالم" نوید فکر "پیر علی محمد راشدی کا کالم" مشرق و مغرب "م۔ ش کا کالم" م۔ ش کی ڈائری "سنجیدہ کالم شمار کیے جاتے ہیں۔" (۱۷)

## علامتی کالم

علامتی کالم میں استعارے، کنایے اور محاورے کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں مارشل لاء کا دور بہت لمبا عرصہ رہا اس دور میں کالم نگاروں نے اپنی بات اخبار کے قارئین تک پہنچانے کے لیے علامتی اسلوب کا سہارا لیا۔ یہ انداز اس لیے اختیار کیا جاتا ہے تاکہ تحریر صحافتی قوانین کی گرفت میں نہ آئے۔ ایسے کالم مارشل لاء کے دور میں یا ہنگامی دور میں زیادہ تر لکھے جاتے ہیں۔ علامتی کالم وہ کالم نویس لکھ سکتے ہیں جنہیں واقعات کے پیش منظر اور پس منظر سے آگاہی حاصل ہو۔

## مشاہداتی کالم

اردو صحافت میں مشاہداتی کالم اپنا ایک خاص مقام رکھتا ہے اور یہ قارئین میں بھی بہت مقبول ہے۔ مشاہداتی کالم کی دو اقسام ہیں۔

## شہر نامہ یا ڈائری نما کالم

اس کالم میں کسی شہر میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور مسائل کے متعلق کالم نویس مشاہدہ کے ساتھ اپنا تجزیہ پیش کرتا ہے۔ اس میں ادبی سماجی، سیاسی، ثقافتی سرگرمیوں کو بھی موضوع بنایا جاتا ہے۔ کالم نویس رپورٹر کی طرح شہر کے مختلف حصوں میں گھوم کر معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر ان کو اپنے تاثرات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس میں قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

## سفر نامہ / سیاحتی کالم

کالم کی اس قسم میں کسی سفر مہم یا تفریح کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ اندرون ملک بیرون ملک کسی بھی سفر نامے کو کالم نگار موضوع بنالیتا ہے عطاء الحق قاسمی محمد رفیق ڈوگر اور مستنصر حسین تارڑ نے اپنے بعض ملکی اور غیر ملکی سفر ناموں کو کالم کی صورت میں لکھا۔

## اقتباسی کالم

اقتباسی کالم میں کسی بھی خبر یا واقعہ کو من و عن بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کالم کم ہی لکھے جاتے ہیں کالم کی اس قسم میں مختلف شخصیات کے اقوال عالمی ادب کے تراجم شعراء کی نظموں اور غزلوں کو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ بعض صورتوں میں ان اقتباسات کے متعلق کالم نویس کا تبصرہ بھی کالم کا حصہ ہوتا ہے۔

## ترکیبی کالم

کالم کی اس قسم میں کالم نویس کسی موضوع پر اظہار خیال کرنے کے لیے مختلف ترکیبی انداز اختیار کرتا ہے۔ اس قسم کے کالموں میں کسی اہم واقعے کو مرکزی نقطہ کی شکل دے کر اس پر اظہار خیال کیا جاتا ہے اور اس قسم کے کالموں کا انداز کسی لطیفے سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے کالم روایتی انداز میں نہیں لکھے جاتے، ان کا آغاز اور اختتام زوردار ہوتا ہے جب کے نفس مضمون ڈھیلا ڈھالا ہوتا ہے بعض اوقات کالموں کا ابتدائی حصہ اور اختتامی حصہ جاندار نہیں ہوتا بلکہ نفس مضمون زیادہ توجہ طلب ہوتا ہے۔

## مکتوباتی کالم

وہ کالم جن میں قارئین کی جانب سے خطوط کو کالم کا حصہ بنایا جائے مکتوباتی کالم کہلاتے ہیں۔ کالم نگار بعض اوقات کسی قاری کے پیغام سے اتنا متاثر ہو جاتا ہے کہ وہ اس پیغام کو آگے قارئین تک پہنچانے کے لیے کالم کا حصہ بنالیتا ہے اور اس پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ بعض اوقات مختلف خطوط کو اس انداز سے ترتیب دیا جاتا ہے کہ کالم نگار بغیر کچھ کہے اپنا پیغام قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

## موضوعاتی اقسام

موضوع کے حوالے سے کالم کی بہت سی اقسام متعین کی جاسکتی ہیں۔ ان میں کسی بھی پیشے، شعبے یا مضمون سے تعلق رکھنے کا کالم شامل ہیں ایسے کالم تب ہی لکھے جاسکتے ہیں جب ان سے متعلق علم و فن موجود ہو۔ یہ کالم عموماً قارئین کی تربیت اور رہنمائی کے لیے لکھے جاتے ہیں۔ ایسے کالم نویسوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ صحافتی زبان پر دسترس حاصل کریں۔ کیونکہ ایک عام پڑھنے والا قاری فنی معاملات سے پوری طور پر آگہی نہیں رکھتا۔ ایسے کالموں کی اہم اقسام درج ذیل ہیں:

## قانونی کالم

ایک عام آدمی کا قانون کے متعلق علم کم ہی ہوتا ہے۔ عام زندگی میں اُسے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن میں قانون کی رہنمائی اُس کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ ناتواں میں قانونی کتب سے استفادہ کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور نہ ہی اتنی فرصت ہوتی ہے۔ اس لیے قانونی کالم کے ذریعے لوگوں کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان کالموں میں حکومت کی طرف سے جاری کیے جانے والے نئے قواعد و ضوابط، نئی اصلاحات، آرڈیننسوں، نئے سرکاری احکامات کی قانونی نقطہ نظر سے سادہ فہم انداز میں وضاحت کی جاتی ہے۔ قارئین کے مسائل کے حل کے لیے انھیں قانونی مشورے بھی دیے جاتے ہیں۔

## طبی کالم

ایسے کالم میں قارئین کو کسی بیماری کی علامات، وجوہات، علاج اور احتیاطی تدابیر سے متعلق معلومات دی جاتی ہے لیکن ان کالموں کا ہر گز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ لوگ خود اپنے طبیب بن جائیں اور پیشہ ور ڈاکٹر سے مشورہ نہ

کریں۔ مریض اپنے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوئے بھی اپنے مرض کے بارے میں تشخیص نہیں کر سکتا اور اس کے بغیر علاج ممکن نہیں ہوتا۔ ایسے کالم کا مقصد لوگوں کو بیماریوں سے بچنے کی ہدایات اور روک تھام کے طریقوں سے متعلق معلومات دی جاتی ہے۔ ایسی غذاؤں کے استعمال کے مشورے دیے جاتے ہیں جن سے بیماریوں کا امکان کم رہ جائے نیز یہ بھی معلوم ہو کہ کس مزاج کے افراد کے لیے کون سی چیز زیادہ مفید ہے اور کون سی چیز اُن کے لیے نقصان دہ ہے۔ طبی کالم انگریزی صحافت سے اردو میں آیا۔ اردو صحافت میں پہلا روزنامہ "کوہستان" لاہور نے باقاعدگی سے "آپ کی صحت" کے عنوان سے طبی کالم کا آغاز کیا۔ اس کے بعد دیگر اخبارات نے بھی صحت سے متعلق کالم شروع کر دیے۔ آج اخبار میں ان کالموں کی بہت اہمیت ہے۔

## دینی کالم

اس کالم کا مقصد قارئین کو روحانی غذا مہیا کی جائے۔ انھیں تقویٰ نیکی اور پاک زندگی کی جانب راغب کیا جائے انھیں یہ بتایا جائے کہ اس مادی دور میں مشکلات ذہن میں جو کھینچاؤ اور کشمکش پیدا کرتی۔ اُسے دور کرنے اور سکون حاصل کرنے کے لیے وہ اللہ اور اُس کے رسول کے احکام سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ حج، عید الفطر، رمضان اور دیگر اہم مواقع کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے بھی یہ کالم لکھے جاتے ہیں۔ جدید دور کے مسائل کے حل کے لیے اسلامی تعلیمات سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ دینی کالم عموماً علماء کرام اور دینی معلومات رکھنے والا افراد لکھتے ہیں۔ ان کالموں میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی متنازعہ معاملات پر نہ لکھا جائے اور کوئی ایسی چیز شائع نہ کی جائے جس سے کسی دوسرے فرد کی دل آزادی ہو۔ نوائے وقت کا ایک کالم "نور بصیرت" کالم ایک عرصہ سے قارئین میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ دیگر اخبارات میں بھی دینی کالم لکھے جاتے ہیں۔

## معاشی کالم

اس کالم میں معاشی صورت حال کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ملک کی معیشت پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کا جائزہ لے کر حکومت کو مختلف اقدامات کو اٹھانے کا مشورہ دیا جاتا ہے اور معاشی کالم عموماً ماہرین معاشیات ہی لکھتے ہیں اور اس کو پڑھنے والے بھی مخصوص ہوتے ہیں۔ تاہم اب معاشی کالم نویس قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے ایسے مسائل پر بھی قلم اٹھاتے ہیں جن کا معاشرے کو کسی صورت میں سامنا ہے۔

## نفسیاتی کالم

پاکستانی اخبارات میں نفسیاتی کالموں کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ قارئین ان کالموں کو بھی دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور ان کالموں کی روشنی میں اپنے روزمرہ زندگی کے نفسیاتی مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ زیادہ تر اس قسم کے کالم ماہرین نفسیات لکھتے ہیں۔ وہ ماہرین جن کو نفسیات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر مکمل عبور حاصل ہو۔

## کھیلوں کا کالم

عموماً اخبارات میں کھیلوں کا ایڈیشن باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ تاہم اہم میچوں کھلاڑیوں اور کھیل سے متعلقہ دوسرے معاملات کی وضاحت کے لیے کھیلوں کے متعلق کالم بھی شائع ہوتے ہیں۔ اور یہ کالم عموماً وہ لوگ لکھتے جو سابقہ کھلاڑی ہوں یا ایسے صحافی جن کا کھیلوں کے متعلق وسیع تجربہ ہو۔

## فیشن

یہ کالم خواتین کے لیے ہوتا ہے اور اسے زیادہ تر خواتین ہی لکھتی ہیں۔ اس کالم میں ملبوسات، ہئیر سٹائل اور فیشن میں جدید رجحانات کے متعلق قارئین کو معلومات دی جاتی ہے۔

## امور خانہ داری

خواتین کی دلچسپی، معلومات، رہنمائی کے لیے کافی اخبارات میں امور خانہ داری سے متعلق کالم شائع ہوتے ہیں۔ ان میں خواتین کو بہتر انداز میں گھر چلانے کی تربیت اور مشورے دیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات مختلف کھانے بنانے کی ترکیب بھی شامل ہوتی ہیں۔ خواتین کی جانب سے جو کوئی سوال ہو تو اس کا جواب بھی اس کالم کا حصہ بنتے ہیں۔

## پامسٹری اور علم نجوم

مغرب میں پامسٹری اور علم نجوم نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ زیادہ شائع ہونے والے اخبارات اس علم کے متعلق باقاعدگی کے ساتھ کالم لکھتے ہیں۔ پاکستانی اخباری قارئین بھی علم نجوم کے متعلق لکھے جانے والے کالم پسند کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام بڑے اخبارات میں یہ کالم شائع ہوتے ہیں۔ ان کالموں میں

دست شناسی اور ستاروں کے متعلق گفتگو کی جاتی ہے۔ قارئین کے خطوط کے جوابات دیے جاتے ہیں۔ "ستارے کیا کہتے ہیں؟" "ہاتھ کی لکیریں"۔ ان سب کے متعلق کالم اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں۔

## اردو کالم کی روایت ۱۹ صدی تک

برصغیر پاک و ہند میں اردو صحافت کا آغاز انیسویں صدی میں ایک اخبار "جام جہاں نما" سے ہوا۔ یہ اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے جاری ہوا۔ اس دور میں جو تعلیم یافتہ افراد تھے اُن کی زبان فارسی تھی۔ اس میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں کی خبریں شائع ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کا کچھ حصہ انگریزی اخبارات سے حاصل کردہ مواد پر مشتمل تھا۔ اس اخبار میں کچھ حصہ ادب کے لیے بھی مخصوص تھا جس میں نظمیں اور غزلیں شامل تھیں۔ اس کی نثر خبروں یا پھر دوسری تحاریر پر مشتمل ہوتی تھی۔ چونکہ اُس وقت صحافت ابتدائی مراحل میں تھی تو صحافتی باریکیوں سے واقف نہ تھی۔ خبر کی زبان صاف اور پرکشش تھی۔ اس اخبار میں خبر کو کچھ اس انداز میں لکھا جاتا تھا جیسے آج کل کالم لکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شفیق جالندھری جام جہاں نما کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" مئی ۱۸۲۲ء میں شروع ہوا۔ جام جہاں نما اخبار مارچ سے جون تک اردو میں شائع ہوتا رہا۔ پھر اسے فارسی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ایک سال بعد اس کی زبان ایک بار پھر جزوی طور پر اردو ہو گئی۔" (۱۸)

اردو صحافت کے ابتدائی مراحل میں ادارہ نویسی، کالم نویسی، خبر نگاری کا تصور واضح طور پر نہیں ملتا لیکن مکتوبات پر ان کا اثر ضرور دکھائی دیتا۔ اخبار کا جو مالک ہوتا تھا وہ خبر میں ہی اپنی رائے کا اظہار کر دیتا تھا۔ برصغیر میں اردو کالم کے آغاز اور ارتقاء کے بارے میں محمد اسلم ڈوگر لکھتے ہیں:

"برصغیر میں کالم کے ارتقاء کا جائزہ لیں تو یہ ہمیں کئی تبدیلیوں سے گزرتا ہوا نظر آتا ہے۔ انیسویں صدی میں ہمیں کالم کی دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ آغاز میں یہ خبری کالم تھا۔ یعنی خبروں کو کالم کی صورت میں درج کر دیا جاتا دوسری دور میں کالم، کالمی مضامین کی صورت میں نمودار ہوا اور اس کا آغاز اودھ پنچ سے ہوا۔" (۱۹)

بیسویں صدی کے شروع میں ہی کالم ایک باقاعدہ صورت میں ہی آگیا اور پھر یہ ایک مستقل عنوان کے ساتھ کالم نگار کے نام کے ساتھ شائع ہونے لگا۔ پاکستان بننے کے بعد کالم نگاری کے چوتھے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کے بعد اردو کالم مختلف تبدیلیوں کے مراحل سے گزر کر صحافت کی ایک صنف کا درجہ اختیار کر گیا۔ ابتدائی دور میں جام جہاں نما کی زبان فارسی تھی مگر بعد میں مئی ۱۸۲۲ء سے یہ اخبار اردو زبان میں شائع ہونے لگا کچھ عرصہ کے بعد اردو زبان میں آنا بند ہو گیا تھا مگر پھر جاری ہوا اور مسلسل ۱۸۲۸ء تک یہ اردو زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار کی خبروں کا جائزہ لیا جائے تو اُن کا اسلوب ایسا تھا جیسے آج کل کالم لکھا جاتا ہے اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کالم نے ابتدائی دور کی خبروں سے جنم لیا ہے۔ جام جہاں نما اخبار کی خبروں کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

"بہت دنوں سے یہ خبر مشہور تھی کہ انگلستان میں ایک جہاز تیار ہوتا تھا، جس طرح ایک ناؤ پچھلے برس کلکتہ میں آئی کہ دھوئیں کے زور سے چڑھاؤ اتار پر بے تکلف دریا میں چلی جاتی ہے۔ وہ جہاز اس طرح بے کھلے بحر محیط میں آمد و شد کرے گا اور اس جہاز کے بنانے والے نے انگلینڈ سے کلکتے پہنچنے کی پیچتر مدد کی مدت ٹھرائی ہے۔ کسی واسطے کے وہ جہاز پال سے علاقہ نہیں رکھتا۔ جو ہوا کا محتاج ہو۔ اس کو آندھی طوفان، موسم، غیر موسم سب برابر ہے۔" (۲۰)

یہ اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" کی ایک خبر ہے مگر اس کا اسلوب، اسلوب کی خوبصورتی اور بیان سے یہ خبر کسی خبر نگار کی ذاتی رائے اور پھر اس کا تبصرہ کسی کالم کا حصہ لگتا ہے۔ خبر لکھنے کا انداز ایسا ہے جیسے آج کل کے کالموں میں اپنایا جاتا ہے۔ آج کل بھی بہت سے اخبارات میں کالم روزمرہ کی خبر کو بنیاد بنا کر لکھے جاتے ہیں اور پھر کالم نویس ان خبروں پر اپنی رائے کا اظہار خوبصورت اور دلچسپ انداز میں کرتا ہے۔ خبر نگاری کا یہ طریقہ صرف "جام جہاں نما" کا نہیں تھا بلکہ اس کے بعد بھی جن اخبارات کی اشاعت ہوئی اُن میں بھی خبر نگاری کا یہ طریقہ تھا۔ اس طرح یہ بات کہی جاسکتی کہ کالم کی جو موجودہ شکل ہے اس کی بنیاد ابتدائی خبریں ہی ہیں اور انھیں خبروں سے کالم میں ارتقا پایا ہے۔

"جام جہاں نما" کے بعد برصغیر میں اردو کا دوسرا اخبار "دہلی اخبار" ۱۸۳۷ء میں مولانا محمد حسین آزاد نے والد محترم جن کا نام مولوی محمد باقر تھا انھوں نے شروع کیا۔ ۱۸۴۰ء کو اخبار کا نام بدلا گیا اور اس کا نام دہلی اخبار سے بدل کر "دہلی اردو اخبار" کر دیا گیا۔ یہ اخبار تقریباً اکیس سال تک جاری رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں مولوی محمد باقر کی شہادت ہو گئی جس کی وجہ سے یہ اخبار بند ہو گیا۔ ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خان کے بھائی سید محمد خان نے دہلی سے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام "سید الاخبار" تھا اور یہ ہفتہ وار اخبار تھا۔ اس کے بعد دہلی سے ایک اخبار شائع ہوا جس کا نام "کریم الاخبار" تھا جو تین سال کے بعد بند ہو گیا تھا۔

دہلی کے بعد اردو صحافت کا دوسرا بڑا مرکز لاہور تھا۔ پنجاب کا سب سے پہلا اخبار "شمس الاخبار" کے نام سے ہفتہ وار شروع ہوا۔ ادارت کے فرائض شیخ عبد اللہ نے سرانجام دیے۔ اس کے بعد منشی ہر سنگھ رائے نے "کوہ نور" کے نام سے لاہور شہر کا پہلا اخبار ۱۸۵۰ء کو جاری کیا یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعد "دریائے نور" شائع ہوا اور رفتہ رفتہ ملک کے تمام اہم اور بڑے شہروں سے متعدد اخبارات شائع ہونے لگے۔ ان تمام اخبارات کی خبروں کا جائزہ لیا جائے تو وہ اخلاقی، علمی، مذہبی، تاریخی کالم نما مضامین کی صورت معلوم ہوتی ہیں۔ ۱۸۵۷ء میں منشی نول کشور نے اودھ پنچ اخبار جاری کیا اور ڈوہتی صحافت کو سہارا دیا۔ یہ اخبار تقریباً پینتیس سال تک جاری رہا۔ اس اخبار نے جدید اردو صحافت کی بنیادی رکھی۔ یہ اردو زبان کا پہلا اخبار تھا جس میں فلسفیانہ، معاشی، معاشرتی، ادبی، علمی، مذہبی مضامین اور مقالے شائع ہوتے تھے جن کو ابتدائی نوعیت کا کالم بھی کہا جاسکتا ہے۔ محمد اسلم ڈوگر اودھ پنچ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"برصغیر کی صحافت میں کالم نویسی کے حوالے سے اودھ پنچ کے دور کو خصوصی اہمیت

حاصل ہے۔ جنگ آزادی سے ۲۰ سال بعد شائع ہونے والے اس اخبار نے ہندوستان کی

صحافتی، سیاسی اور معاشرتی زندگی پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔" (۲۱)

اردو صحافت میں انیسویں صدی کا آخری ربع پنچ اخبارات کا تھا۔ انھوں نے اس دور میں اردو صحافت پر جو اثرات مرتب کیے انہیں اب تک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک کالم نگاری کا تعلق ہے اودھ پنچ کی زیادہ تر تحریریں اپنے اسلوب اور مزاج کے حوالے سے کالم کی تحریریں تھیں۔ اخبار کے بانی منشی سجاد حسین نے انگریزوں کے اُس غلامی کے دور میں جب اُس وقت کے حکمرانوں پر تنقید نہیں کی جاسکتی تھی اپنے اخبار میں اس طریقے کو

جگہ دی اور بات پر طنز و مزاح کا لبادہ اوڑھ کر پیش کیا۔ اردو زبان و ادب اور صحافت کو اس سے بڑا فائدہ ہوا اس دور میں باقاعدہ کالم نگاری کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد سرسید احمد خان کا پہلا اخبار جس کا نام "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا یہ دوسرے اخبار کی طرح ایک مستقل عنوان سے تو کالم شائع نہیں کرتا تھا مگر اس میں سرسید مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے تھے، یہ سنجیدہ مضامین تھے جو آنے والے وقت میں سنجیدہ کالم نگاری کرنے والوں کے لیے رہنما ثابت ہوئے۔

سرسید کا دوسرا اخبار "تہذیب الاخلاق" ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا اس کی زبان اردو تھی۔ اخبار کا مقصد سماجی اصلاح تھا۔ تہذیب الاخلاق میں سرسید کی جانب سے یہ درج تھا کہ تہذیب الاخلاق کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کو اعلیٰ تہذیب اختیار کرنے کی تلقین کرنا ہے۔ اس کے حوالے سے سرسید مسلسل مسلمان معاشرے کی بہتری کے لیے مختلف مضامین لکھتے رہے۔ یہ سرسید کے مضامین بہت پر اثر ہوتے تھے پڑھنے والے اُن مضامین سے بہت اثر قبول کرتے تھے۔ سرسید اور اُن کے رفقاء کے مضامین جنہیں ذاتی کالم کہا جاسکتا ہے۔ اردو کالم نگاری کی جڑوں کو ان مضامین نے بنیاد فراہم کی۔ اگر جدید دور کے اخبارات کا جائزہ لیا جائے تو اردو اخبارات میں سنجیدہ نوعیت کے سیاسی کالم شائع ہوتے ہیں جس کا مقصد حکومت کی پالیسیوں پر تنقید اور اُن کے اثرات، عوام کے مسائل کا ذکر اور حکومت کی توجہ اُن کی جانب مبذول کرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اردو میں ایسے کالم کی ابتدا انھیں مضامین سے ہوئی ہے۔

## اردو کالم اور بیسویں صدی

اردو صحافت جب بیسویں صدی میں داخل ہوئی تو متعدد ترقی کی منازل طے کر چکی تھی۔ سرسید احمد خان مغربی تجربات سے استفادہ حاصل کرنے کی روایت ڈال چکے تھے۔ انگریز اپنے خلاف کچھ سننے کو تیار نہ تھے اخباروں نے طنز و مزاح کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار "الہلال" کو اردو صحافت میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ محمد اسلم ڈوگر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"کالم کے جدید انداز کے بانی بھی مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۱۲ء میں کالم کا آغاز کیا۔ ان کا کالم مستقل عنوان اور لکھنے والے کے نام کے ساتھ شائع ہوتا تھا۔ مولانا آزاد کا یہ کالم "افکار و حوادث" کے عنوان سے "الہلال" میں ہی شائع ہوتا تھا بلکہ یہ ان

کے دوسرے جریدے "البلاغ" میں شائع ہوتا رہا۔ کبھی مولانا ابوالکلام آزاد کے اپنے نام سے اور کبھی اُن کے قلمی نام سے شائع ہوا۔" (۲۲)

اردو کالم نویسی کے متعلق یہ بات خاصی دلچسپ ہے کہ فکاہیہ کالم نگار ایسی شخصیات تھی جن کا سیاست اور ادب میں مرتبہ بلند تھا۔ اُن کا سنجیدہ شخصیات کے حوالے سے جانا جاتا تھا مگر انھوں نے ہی فکاہیہ انداز اپناتے ہوئے اپنی بات کا اظہار کیا۔ اسی دور میں ملار موزی نے ایک نئے انداز کے کالم لکھنے شروع کیے ان کے کالموں کا اسلوب اور زبان منفرد تھا۔ اُن کی اردو گلابی اردو سے مشہور ہوئی اور صحافت میں ایک زبردست روایت قائم کی۔ اردو کے ابتدائی دور کا ایک اخبار مولانا محمد علی جوہر کا "ہمدرد" ہے۔ یہ فروری ۱۹۱۳ء کو جاری ہوا۔

اس دور میں ایک اور اردو اخبار زمیندار اپنے عروج پر تھا۔ مگر اس کے باوجود "ہمدرد" اخبار کو مختلف ادبی علمی اور صحافتی حلقوں کی جانب سے پذیرائی ملی۔ مولانا محمد علی جوہر نے صحافت میں جارحانہ انداز اپنانے کے بجائے غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا۔ اُن کی تحریریں نہایت آسان زبان اور سلیس ہوتی تھی۔ "ہمدرد" میں اُن کے کالم کا عنوان "کشکول" تھا۔ وہ اس کے ذریعے انگریزوں پر تنقید کرتے اور عوام کے دلوں کو گرماتے تھے۔

خواجہ حسن نظامی کا نام بھی بیسویں صدی کی اردو صحافت کے افق پر ایک روشن ستارے کی مانند چمک رہا ہے۔ اُن کی تحریروں میں مزاح زندہ دلی کی چاشنی موجود ہے۔ اُن کے کالمی مضامین میں ظرافت اور مزاح متانت کے پردے میں سامنے آتی ہے اور پڑھنے والوں پر خوش گوار اثر چھوڑتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں مولانا ظفر علی خان نے "ستارہ صبح" کے نام سے ایک اخبار جاری کیا۔ اس میں "مکافات" اور "جواہر دیرے" کے نام سے مستقل عنوانات سے پہلے ہی صفحہ پر کالم لکھتے تھے۔ اُن کے اکثر کالموں میں سیاسی اور سماجی حالات پر بحث کی جاتی تھی۔

۲۱-۱۹۲۰ء میں چراغ حسن حسرت ایک عمدہ کالم نگار کے طور پر سامنے آئے۔ انہوں نے "سند باد جہازی" کے نام سے کلکتہ کے روزنامہ "نئی دنیا" میں کالم لکھنے شروع کیے۔ اُن کے کالم بہت مقبول ہوئے حتیٰ کہ لاہور کے دوسرے اخبارات اُن کی نقل کرنے لگے۔ اردو صحافت کی تاریخ کا پہلا باقاعدہ کالم جو ادارتی صفحہ پر شائع ہوتا رہا وہ مولانا عبد المجید سالک کا کالم تھا۔ یہ تیس سال تک جاری رہا۔ ابتداء میں اُن کے کالم "زمیندار" میں کبھی کبھار شائع ہوتا تھا۔ مگر بعد میں جب اخبار کے ساز میں اضافہ ہوا تو اُن کا کالم باقاعدگی سے شائع ہوتے تھے۔

عبد المجید سالک نے کافی عرصہ تک کالم نگاری کی اور انھوں نے کالم کو بام عروج پر پہنچایا۔ مولانا عبد المجید سالک کے کالموں کی بہت مقبولیت تھی اُن کے کالموں کے بغیر اخبار نامکمل تصور کی جاتی تھی۔ اس دور کی اردو کالم نگاری کی روایت کو مجید لاہوری اور حاجی لق نے آگے بڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ حاجی لق نے ۱۹۳۲ء میں کالم نگاری کا آغاز کیا۔ انھوں نے مختلف اخبارات اور رسائل میں کالم نگاری کی۔ اُن کے کالم کا عنوان "فکات" تھا۔ اس کے علاوہ اُن کو شاعری کا بھی شوق تھا اور کتب بھی لکھی۔

مجید لاہوری نے قیام پاکستان سے قبل کالم نویسی کا آغاز کیا اُن کا اصل نام مجید چوہان تھا۔ پاکستان بننے کے بعد مجید لاہوری "جنگ" کراچی سے مسلسل کالم نگاری کرتے رہے۔ ان کی تحریر کی زبان سادہ اور عام فہم تھی۔ اُن کے کالموں کے موضوعات اکثر عام آدمی کی زندگی کے متعلق ہوتے تھے۔ اس لیے اُن کے کالم کا سب کو انتظار ہوتا تھا۔ اس دور کے ایک اہم کالم نگار شوکت تھانوی تھے۔ انھوں نے کافی عرصہ تک مختلف اخبارات اور رسائل میں کالم نگاری کی اور معاشرے میں درپیش مسائل پر قلم اٹھایا۔ انھوں نے "ہدم" کے علاوہ "اودھ اخبار" اور "روزنامہ ہند" میں بھی کالم لکھے۔

۱۹۳۸ء میں ابو ظفر نازش روناہ "سیاست" میں کالم نگاری کرتے تھے۔ اُن کے کالم کے عنوان کا نام راز و نیاز تھا اور وہ فکاہیہ کالم نگاری کرتے تھے۔ اسی دور میں معروف افسانہ نگار حیات اللہ انصاری بھی لکھنؤ کے اخبار میں فکاہی کالم نگاری کرتے تھے۔ حمید نظامی نے بطور کالم نویس بہت شہرت حاصل کی۔ وہ جہنم کے مستقل عنوان کے ساتھ "ہمایوں" لاہور میں کالم نگاری کرتے تھے۔ حمید نظامی فکاہی کالم نگاری کرتے تھے۔ عبد الماجد دریا آبادی کا "سچی باتیں" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے تھے اس طرح اردو کالم نگاری کی روایت آگے بڑھتی گئی۔

## قیام پاکستان کے بعد اردو کالم نگاری

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو اُس وقت پاکستانی صحافت کا بڑا مرکز لاہور تھا۔ لاہور سے اُس وقت مختلف اخبارات جن میں "نوائے وقت"، "روزنامہ آزاد"، "روزنامہ احسان" اور "روزنامہ انقلاب" کی اشاعت ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندی اخبارات بھی تھے اور کچھ اخبارات انگریزی کے بھی تھے مگر تقسیم کے بعد وہ یا تو ختم ہو گئے یا پھر ہندوستان منتقل ہو گئے۔

لاہور کے علاوہ گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور کراچی سے بھی اخبارات کی اشاعت ہوتی تھی۔ کراچی سے "روزنامہ جنگ"، "روزنامہ ڈان"، "انجام" اور "مارنگ نیوز" شائع ہوتے تھے۔ اس دور میں لاہور کے اردو اخبارات میں جو اہم کالم شائع ہوتے تھے۔ ان میں مولانا عبد المجید سالک کا افکار و حوادث، جو روزنامہ انقلاب میں شائع ہوتا تھا۔ مولانا حسرت سندباد جہازی کے قلمی نام سے کالم لکھا کرتے تھے، روزنامہ آزاد میں مجید لاہوری کا کالم مطالبات اور روزنامہ زمیندار میں علامہ لطیف کا کالم "فکات" اور روزنامہ نوائے وقت میں حمید نظامی کا کالم "سرراہے" شامل تھا۔ اس کے علاوہ ایک روزنامہ "احسان" جس میں ظہیر کاشمیری نے بھی دو سال تک کالم نگاری کی وہ "مجنوں" کے قلمی نام سے "حکایات مجنوں" لکھتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں لاہور سے روزنامہ امروز کا اجراء ہوا۔ اخبار کے مدیر مولانا چراغ حسن حسرت نے حرف و حکایت کے نام سے اپنا کالم اس اخبار میں لکھنا شروع کر دیا۔ اُن کے علاوہ سید سلطان عارف کا کالم "گاہے گاہے" جو کھیلوں کے متعلق تحقیقی کالم تھا اسی اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ قیام پاکستان کے دو سال بعد لاہور کے اخبار وفاق میں "لاہور کی ڈائری کے عنوان سے محمد شفیع کا کالم چھپنے لگا۔ ۱۹۵۰ء میں ظہیر کاشمیری کا سماجی اور ثقافتی کالم "شہر خیال" شائع ہوا۔ اس کے علاوہ شوکت تھانوی کا کالم "وغیرہ وغیرہ" اور "پہاڑ تلے" شائع ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں چراغ حسن حسرت کی اخبار سے علیحدگی کے بعد احمد ندیم قاسمی نے کالم نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

صحافت کی دنیا میں ایک اور شاندار اضافہ ۱۹۵۳ء میں کوہستان کی صورت میں ہوا۔ یہ اخبار راولپنڈی سے شائع ہوتا تھا مگر جلد ہی لاہور اور ملتان سے بھی شائع ہونے لگا۔ اس اخبار میں دینی اور طبی کالم شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۵ء میں نوائے وقت نے بھی طب اور سائنس کے عنوان سے کالم کا آغاز کیا۔ اس اخبار میں حسین احمد صدیقی "لخت لخت" کے عنوان سے اور چراغ حسن حسرت "باغ و بہار" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں کوہستان ملک کا ایک نمایاں اخبار تھا اور عنایت اللہ کا تعمیری ذہن اس اخبار میں خوب صورت تجربات کر رہا تھا۔ اسی سال "کوہستان" لاہور میں احسان بی۔ اے نے میری ڈائری کے عنوان سے کالم نگاری شروع کی۔ کوہستان اخبار میں اس وقت مظہر الدین کا کالم بھی شائع ہوتا تھا۔ اُن کے کالم کا عنوان "نشان راہ" تھا۔ ۱۹۶۳ء میں اردو کا ایک اور اخبار مشرق شائع ہوا۔ اس کو جاری کرنے والی شخصیت عنایت اللہ تھے۔ اس اخبار میں کالموں پر خصوصی توجہ دی گئی۔ یہ اخبار مقامی اور غیر مقامی خبریں تفصیل کے ساتھ شائع کرتا تھا۔ اس اخبار میں کالموں کے

ساتھ ساتھ کالم نگاروں کی تصاویر بھی شائع ہوئی۔ اس اخبار میں کالم نگار مظہر الدین کا دینی کالم "نشانِ راہ" حکیم آفتاب قریشی کا کالم "آپ کی صحت" اور احسان بی۔ اے کا کالم "ڈائری" باقاعدہ سے شائع ہوتا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ایوب خان نے اقتدار محمد یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ اس دوران لکھے جانے والے کالموں میں پیشتر کالم سیاسی کیفیت کے ترجمان تھے۔ اس دور میں معاشرتی مسائل پر لکھے جانے والے کالموں کی مقبولیت کم ہونے لگی۔

اس دور میں کالم نگاروں میں مجیب الرحمن شامی مختلف عنوانات کے ساتھ فکاہی کالم لکھتے۔ ندائے ملت لاہور سے اے آر خالد "اسے مت پڑھیے" کے عنوان سے جبکہ وقار انبالوی فکاہی کالم "بات سے بات" میاں محمد شفیع "مش کی ڈائری" اور عبدالقادر حسن "سیاست نامہ" لکھتے رہے۔ روزنامہ "مشرق میں" میں ارشاد احمد خان کے فکاہی کالم "آج کی باتیں" اور راشد ثار کے کالم "نہ حکایتیں نہ شکایتیں" کے عنوان سے شائع ہوتے رہے جبکہ اسی اخبار میں ڈاکٹر عبدالسلام اپنے کالم "واقعات عالم" میں تمام امور کا جائزہ لیتے رہے۔ روزنامہ مساوات میں لاہور سے نذیر ناجی نے سیاسی کالم لکھے۔ مساوات میں ہی منوبھائی "گریبان" کے عنوان سے کالم بھی لکھتے رہے۔ مساوات میں دیگر کالم نگاروں میں عبدالقدیر رشک کا کالم "اندھیرے اجالے" کے عنوان سے شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ظہیر کاشمیری، عباس اطہر، ظہیر باد بھی مختلف عنوانات سے کالم نگاری کرتے رہے۔ لاہور سے ہی جاری ہونے والا ایک روزنامہ جس کا نام "جاوداں" تھا اس روزنامہ میں اکرام رانا "حرف شیریں" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔ جبکہ دیگر کالم نگاروں میں وارث میر "رنگ آہنگ" اور منیر احمد منیر "زندہ ہے لاہور" کے عنوان سے کالم لکھتے رہے۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۹ء تک آمریت کے دور میں تحریر و تقریر پر پابندیاں تھیں۔ یوں کالم نگاروں نے علامتی رنگ اپنایا۔ اس عہد کے نمایاں کالم نگاروں میں حکیم آفتاب، قمر انبالوی، شوکت تھانوی، ابن انشاء، شیر احمد اختر، ایس۔ ایم ناز، عبدالقادر حسن، سلیم تابانی، ظہیر بابر، ابراہیم جلیس، احسان بی۔ اے اور اکرام رانا کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس طرح اس دور کی خواتین کالم نگاروں میں نرگس پروین، شمیم اختر، امینہ امبرین، فرزانہ نظیر، رخشندہ حسن اور ش۔ فرخ کے نام شامل ہیں۔

۱۹۶۹ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک کا دور جمہوریت کی بحالی کا دور ہے۔ اس عہد میں سیاسی حالات و واقعات کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ اس دور کے کالم نگاروں نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی، ۱۹۷۳ء کے آئین کی تیاری و نفاذ،

قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینا جیسے موضوعات پر کالم لکھے۔ اس عہد کے معروف کالم نگاروں میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، منو بھائی، نصر اللہ خان عزیز، مسعود احمد، نذیر ناجی اور عباسی اطہر، نے سیاسی، معاشی، معاشرتی، قانونی، نفسیاتی اور مذہب کو اپنے کالموں میں موضوع بنایا۔

۱۹۸۸-۱۹۷۷ء تک ضیاء الحق کے آمریت کے دور کو دیکھا جائے تو یہ عہد صحافت پر پابندی کا دور تھا۔ کئی صحافیوں کو پابند سلاسل کیا گیا۔ انھیں قید بامشقت کی سزائیں بھگتنا پڑی۔ اس عہد کے اہم کالم نگاروں میں عبدالرحمن شامی، مولانا کوثر نیازی، ظفر اقبال، ارشاد احمد حقانی، نفیس صدیقی، رفیق ڈوگر اور میاں شفیق کے نام زیادہ معروف ہیں۔

۱۹۹۹-۱۹۸۸ء کے دور جمہوریت میں جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ یہ دور صحافت کے حوالے سے حوصلہ افزا دور تھا۔ اس دور میں تحریر و تقریر پر کسی قسم کی کوئی قدغن نہیں تھی۔ ملک اس عہد میں سیاسی عدم استحکام کا شکار رہا۔ دو بڑی جماعتوں کی حکومتیں بنی اور ٹوٹتی رہیں۔ اس عہد میں مستنصر حسین تارڑ، جاوید چودھری، زاہدہ حنا، مقبول جان، رئیس فاطمہ، مشفق خواجہ، عرفان صدیقی، عطاء الحق قاسمی کے علاوہ ڈاکٹر انور سدید، عبدالقادر حسن اور حسن نثار نے کالم نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔

۱۹۹۹ء سے ۲۰۱۹ء تک کے دور میں اولین آٹھ برس مشرف کے آمرانہ دور میں گزرے۔ باقی عرصے میں جمہوریت آگے بڑی۔ لمبے عرصے تک جمہوریت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دکھائی دے رہی ہے۔ جمہوریت کے اس دور میں صحافتی دنیا میں جن کالم نگاروں نے شہرت حاصل کی ان میں ڈاکٹر انور سدید، ظفر اقبال، ڈاکٹر شاہد صدیقی، مسعود اشعر، سعید فدوائی، اصغر ندیم سید، راؤف کلاسرا، حامد میر، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، مجیب الرحمن شامی، مستنصر حسین تارڑ، ہارون الرشید، اوریا مقبول جان اور نذیر ناجی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

دور جدید میں روزنامہ محاسب، آزادی، امن، نوائے وقت، نیوز مارٹ، اوصاف، خبریں، جناح، جسارت، دنیا اور اساس جیسے اخبارات نے کالم نگاری کی روایت کو مزید تقویت بخشی۔ مذکورہ بالا اخبارات میں کالم نگاروں نے مختلف النوع موضوعات پر خامہ فرسائی کی۔ جن میں حالات حاضرہ کے مسائل، اکیسویں صدی کے تقاضے اور

مسائل، سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی سمیت مذہبی، سائنسی اور منطقی موضوعات کے توسط سے اپنی فکر کو صحافتی دنیا پر منقش کیا۔

## ج۔ مستنصر حسین تارڑ اور اُن کی کالم نگاری

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بے شمار انسان پیدا کیے ہیں جو مختص کردہ وقت اس دنیا میں گزارتے ہیں اور پھر اس دنیا فانی سے ہمیشہ کے لیے چلے جاتے ہیں۔ بہت سے انسانوں میں سے چند افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہوتا ہے۔ انہیں خوبیوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنی قابلیت، محنت اور لگن سے وہ کوئی نہ کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیتے ہیں کہ اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی وہ لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہ جاتے ہیں اور اُن کے اُس کارنامے کو ہمیشہ یاد رکھا جاتا ہے۔ اُن چند خوش قسمت افراد کی فہرست میں ایک قابل قدر نام مستنصر حسین تارڑ کا بھی آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اردو ادب کے دور جدید کے ایک نامور سفر نامہ نگار، کالم نگار، ناول نگار، افسانہ نگار، طنز و مزاح نگار، دانشور، ادیب، ٹی وی میزبان اور پاکستان ٹیلی ویژن کے مختلف ڈراموں میں اداکاری کے جوہر بھی دکھا چکے ہیں۔ فرزانہ سید مستنصر حسین تارڑ کا تعارف یوں لکھتی ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ سفر نامہ نگار، ناول نگار، ڈرامہ نویس، افسانہ نگار، کالم نویس اور ٹیلی ویژن کے ایک اداکار کی حیثیت سے ادبی، ثقافتی اور صحافتی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے ہیں۔" (۲۳)

ایم آر شاید لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ اس عہد کے مقبول ترین ناول نگاروں اور سفر نامہ نویسوں میں سے ہیں۔ وہ ایک کل وقتی صاحب قلم ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کے کئی ڈرامہ سیریل اور طویل دورانیے کے ڈرامے پیش کیے جا چکے ہیں۔ وہ ایک کالم نگار، اداکار اور اینکر پرسن کے طور پر بھی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔" (۲۴)

نام ورا دیب مستنصر حسین تارڑ یکم مارچ ۱۹۳۹ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق ایک جاٹ خاندان

سے ہے۔ اُن کے والد بھی باشعور اور پڑھے لکھے شخص تھے۔ اُن کا خاندانی پیشہ کاشتکاری تھا اور والدہ ایک گھریلو خاتون تھی۔ اُن کے چھ بہن بھائی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی ابتدائی تعلیم لاہور سے تھی۔ انٹر میڈیٹ کا امتحان بھی لاہور سے پاس کیا اور انٹر میڈیٹ کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں ایک ٹیکنیکل کالج میں دو سالہ ڈپلومہ حاصل کیا۔ یورپ میں اپنے قیام کے دوران انھوں نے سیر و سیاحت کو بھی جاری رکھا اور بعد میں اُن واقعات کو ضبط تحریر میں لایا۔ مستنصر حسین تارڑ کی تخلیقات شروع میں اُن کی آمدنی کا ذریعہ بنی۔ بعد میں انھوں نے مختلف ٹی وی شوز میں میزبانی کا کردار ادا کیا اور مختلف ڈراموں میں بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

"وہ جیو کے پاپولر پروگرام شادی آن لائن میں بھی میزبان کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ٹی وی کمپننگ اور اخبارات کے لیے کالم نگاری کے علاوہ سفر نامے اور ناول اُن کے لیے معقول ذریعہ آمدنی ہیں۔" (۲۵)

مستنصر حسین تارڑ کی شادی میمونہ بیگم سے ہوئی جو ایک راجپوت خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اُن کے تین بچے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی زندگی میں سب سے زیادہ متاثر اپنے والد سے ہوئے وہ اکثر اپنی تصانیف میں اُن کا تذکر کرتے نظر آتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ صاف طبیعت کے انسان ہیں۔ وہ دوسرے ادیبوں پر تنقید کرنے کی بجائے اپنی ذات پر تنقید کرنا پسند کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے نظریہ فن کے بارے میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

"دوحہ قطر میں ایک ایوارڈ کی تقریب میں مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے فن کے بارے میں کچھ بولوں بس اتنا کہنا مجھے تو کچھ علم نہیں کہ میرا فلسفہ کیا ہے اور فن کیا ہے۔ بس مجھے یہ معلوم ہے کہ کبھی اوپر والے نے نیچے نظر ڈالی تو اُسے ایک بے کار، سست اور بے علم شخص نظر آیا جو کتابوں میں گم رہتا ہے جو کاروبار میں کامیاب نہیں ہو سکتا نہ ملازمت مل سکتی ہے تو اُس نے سوچا اس بندے کا کیا کروں کیونکہ اس کو کوئی طور پر عزت عطا کروں تاکہ یہ زندگی گزار سکے اس کے سوانہ کوئی میرا فن ہے نہ فلسفہ" (۲۶)

مستنصر حسین تارڑ کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ایک رسالہ جس کا نام قندیل ہے اُس سے ہوا۔ یہ ایک ہفتہ وار رسالہ تھا اور اس میں اُن کا سفر نامہ سلسلہ وار شائع ہوتا رہا۔ اُس سفر نامہ کا عنوان "لندن سے ماسکو تک" تھا۔

اُس کے بعد اُن کی تحریروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مستنصر حسین تارڑ کا پہلا سفر نامہ جو کتابی صورت میں منظر عام پر آیا اُس کا عنوان "نکلے تیرے تلاش میں" تھا اور یہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس سفر نامے کو ادبی دنیا کی جانب سے بہت پسند کیا گیا۔ اسی سفر نامے سے جدید سفر نامے کی بنیاد پڑی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غفور قاسم لکھتے ہیں:

"اس سفر نامے کی اہمیت یہ ہے کہ اردو ادب میں سفر نامے کو باقاعدہ تخلیقی صنف کا درجہ دلانے میں اس سفر نامے کو اولیت حاصل ہے۔ یہ ہی سفر اردو سفر نامے کے عہد جدید کا نقطہ آغاز ہے۔" (۲۷)

اس کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور یہ سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے آج بھی جاری ہے۔ اُن کے مشہور سفر نامہ "اندلس میں اجنبی" ۱۹۷۶ء میں منظر عام پر آیا اور سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے اس سفر نامے کے کافی ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس سفر نامے میں اندلس کے شہروں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی۔ اس میں اس شہر کی تاریخی شان و شوکت کے ساتھ ساتھ اُن کی خستہ حالی کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ خانہ بدوش مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور زبردست سفر نامہ ہے۔ اور یہ سات برس میں مکمل ہوا۔ یہ سفر نامہ لبنان، اٹلی، ترکی، شام، افغانستان اور ایران کی سیاحت پر مشتمل ہے۔ یہ سفر نامہ ایک سیاحتی رزمیہ کی صورت میں ہے۔ اس میں دکھ ملال کی برچھیاں ملتی ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اس سفر نامے کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سڈنی شیلڈن کے کسی ناول کی طرح یہ سفر نامہ تحیر، سسپنس اور سنسنی خیزی سے بھرپور ہے۔ قدم قدم پر موت سے ملاقات، ناقابل یقین اور روگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات ڈرامائی کیفیات طنز تجسس اور جنسی مظاہر۔" (۲۸)

ان سفر ناموں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے ہنزہ داستان، سفر نامہ شمال کے، کے ٹوکھانی، ناٹکا پر بت، پاک سرائے، تبولیک، چترال داستان، کالاش، بریلی پہاڑیاں اور رتی گلی شامل ہیں۔ سفر ناموں میں مستنصر حسین تارڑ کا اسلوب سادہ اور شگفتہ ہے۔ انھوں نے سفری حالات و واقعات کو ذاتی جذبات کی آمیزش کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے سفر ناموں میں ماضی، حال اور مستقبل تینوں کا ذکر ملتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے سفر ناموں کے علاوہ بہت سے ناول بھی لکھے ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کے علاوہ

پنجابی زبان میں بھی ناول تحریر کیے ہیں۔ اُن کے ناولوں میں مختلف قسم کے موضوعات ملتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناولوں میں مختلف تہذیبوں کو بیان کیا ہے۔ پیار کا پہلا شہر اُن کا پہلا ناول ہے۔ یہ انسانی جذبوں کے درمیان تصادم کی ایک داستان ہے۔ "پرندے" ناول کا پہلا نام "پکھیرو" تھا۔ جو کہ اس کا پنجابی نام تھا۔ مستنصر کے اس ناول میں دیہی معاشرے کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

"راکھ" ایک شاہکار ناول ہے۔ جو حقیقت کے زیادہ قریب نظر آتا ہے۔ اس میں سیاسی، سماجی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے غم کو اس واقعے نے پاکستان اور اس میں رہنے والے مسلمانوں کی تاریخ بدل ڈالی اور لوگوں کی نفسیات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مصنف نے کرداروں کے ساتھ اس واقعے کو عمدگی کے ساتھ ناول میں بیان کیا۔ "بہاؤ" مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور عمدہ ناول ہے۔ اس ناول میں وادی سندھ کی تہذیب کو بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں تخیلاتی انداز کو اپنا کر ایک معدوم اور پرانی تہذیب کو نئے سرے سے زندہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس ناول میں سندھی، سرائیکی، سنسکرت اور براہوی زبان کے الفاظ ملتے ہیں۔ "قربت مرگ میں محبت" ناول سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں انسانی جذبات اور احساسات کی ترجمانی کی گئی۔

قلعہ جنگی مستنصر حسین تارڑ کا یہ ناول ۲۰۰۲ء میں سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ اور یہ ناول امریکہ افغانستان جنگ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ بیرونی سازشوں کا شکار ہو کر مسلمان کس طرح ایک دوسرے کے خلاف لڑ رہے تھے اور دونوں جانب شہید ہو رہے تھے۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں شامل دیگر ناول ڈاکیا اور جولاہا جو ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ "خس و خاشاک زمانے" ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ اے غزال شب ناول بھی ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا۔ دیس ہوئے پردیس، چسپی اور فاختہ بھی مستنصر حسین تارڑ کے ناولوں میں شامل ہیں۔ ان کے بہترین ناولوں کی وجہ سے اُن کو بہت سے ایوارڈ سے بھی نوازا گیا اور اُن کے ناولوں کے دوسری زبانوں میں تراجم بھی ہوئے۔ اُن کے ناولوں پر جامعات میں تحقیق بھی ہوئی اور تحقیق کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ ان کے پہلے مجموعے کا نام سیاہ آنکھ میں تصویر اور دوسرے افسانوی مجموعے کا نام ۱۵ کہانیاں ہیں۔ اُن کے افسانوں میں سماجی عدم مطابقت، برداشت کی کمی، انتہا

پسندی، فرقہ واریت جیسے معاشرے میں موجود امراض کی نشاندہی کی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے بطور ڈرامہ نگار کافی شہرت حاصل کی۔ انھوں نے پنجابی اور اردو زبان میں ڈرامے لکھے۔ ان کے لکھے گئے ڈراموں کو ٹیلی ویژن پر پیش کیا گیا اور کتابی صورت میں سنگ میل پبلی کیشنز کی جانب سے شائع کیا گیا۔ اُن کے ڈراموں کے عنوانات ہزاروں میں راستے، سورج کے ساتھ ساتھ، مورت، پرواز، صاحب سرکار ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے مختلف اصنافِ نثر میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہیں صحافت کے میدان میں بھی اپنی کالم نگاری کی وجہ سے بہت مقبول ہیں۔ وہ اپنے مزاحیہ اسلوب کی بدولت معاشرے میں موجود مسائل کو مزاح کے پردے میں لپیٹ کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ مختلف اخبارات میں کالم لکھتے رہے ہیں اور آج تک لکھ رہے ہیں۔ وہ آج کل اخبار جہاں میں کارواں سرائے کے نام سے لکھ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ۹۲ نیوز، روزنامہ مشرق اور انگریزی اخبار The Dawn میں بھی بہت عرصہ تک کالم نگاری کرتے رہے۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں سماج میں ہونے والے حالات و واقعات کو علامتی اور مزاحیہ انداز سے بیان کرتے ہیں۔ اُن کے اکثر کالموں میں سماجی، اقتصادی، سیاسی، معاشی مسائل کو موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ وہ اپنے کالموں میں مختلف سماجی برائیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور ان کی طرف معاشرے میں موجود افراد کے رویوں پر علامتی انداز میں طنز کرتے نظر آتے ہیں۔ ایک اچھی اور بہترین کالم نگاری اُسی صورت میں وجود میں آسکتی ہے جب ایک کالم نگار زمانے کے غم کو محسوس کرے گا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

"کالم نگاری کے لیے کالم نگار کا صرف ظریف ہونا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کا باظرف ہونا

بھی ضروری ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ان دونوں صفات سے متصف ہے۔ ان کی حس

مزاح اور طبعی بشاشت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے مختلف سماجی، ادبی موضوعات

پر رمزیہ تبصروں کے ذریعے قارئین ادب کے وسیع حلقے کی توجہ حاصل کی ہے۔ اُن کی

کالمانہ تحریروں میں بے ساختگی اور شوخی کا پہلو نمایاں ہے۔" (۲۹)

مستنصر حسین تارڑ کے کالم عام فہم اور چاشنی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے کالموں کو

پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ روزمرہ کے مسائل کو عام اور ہلکے پھلکے انداز میں مزاح کے ساتھ پیش

کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں روزمرہ کے واقعات سے مزاح کشید کرتے ہیں۔ وہ ہمارے روزانہ کے معمولات اور ارد گرد کے حالات و سانحات پر گہری نظر ڈالتے ہیں اور طنز و مزاح کی آمیزش کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔" (۳۰)

مستنصر حسین تارڑ ایک کامیاب ناول نگار، افسانہ نگار اور سفر نامہ نگار ہیں اور اس بات کا اظہار اُن کے کالموں سے بخوبی ہوتا ہے وہ اپنے کسی کالم میں سفر کی کہانی بیان کر دیتے ہیں وہ اپنے اکثر کالموں میں تخیلاتی دنیا میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ بات سے بات نکالنا بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لیے بعض اوقات اُن کے کالم میں انشائیہ خدوخال سامنے آتے ہیں۔ اُن کے کالم میں کہانی پن کی فضا دکھائی دیتی ہے۔ کسی بھی سیاسی یا سماجی نکتہ کو وہ کہانی اور کرداروں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ کہانی کے ذریعے وہ اپنے کالموں میں مکالمے کی فضا بناتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں کالم کا اختتام ایک فکر انگیز نکتہ پر ہوتا ہے۔ اُن کے کالم، تحریر کا طریقہ اور کالموں کے موضوعات یکسانیت سے پاک ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا خاص موضوع ادب بھی ہے وہ اکثر اپنے کالموں میں کسی ادبی شخصیت کے بارے میں تذکرہ کرتے ہیں یا اُن کی کسی تحقیق کے بارے میں ذکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً اُن کا ایک کالم ہے جس کا عنوان "رحیم گل کے حصے کے سانس" ہے۔ اس کالم میں وہ مشہور ناول نگار رحیم گل کی زندگی کے آخری حالات کو بیان کر رہے ہیں کہ وہ آخری کن پریشان کن اور خراب حالات میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اُن کے کالم کا ایک اقتباس ہے:

"ایک ادیب دوست نے پوچھا۔ رحیم گل کو دیکھنے لگے ہو میں نے کہا نہیں یارس نہیں جاسکا فرصت نہیں ملی ویسے وہ دوست آدمی ہے۔ اعلیٰ پائے کا ادیب ہے۔" (۳۱)

اسی کالم میں وہ آگے جا کر لکھتے ہیں:

"چار پانچ برس پہلے جب پہلی مرتبہ اس پر فاج کا حملہ ہوا تھا تو میں باقاعدہ اس کی مزاج پر سی کرنے گیا تھا۔ ایک دیوار کے باہر برآمدے میں پڑا تھا اور مجھے کچھ کچھ شرمندگی ہوئی۔ لوگ کیا کہیں گے کہ تارڑ کے دوست ایسے ہیں کہ کسی گلبرگی ایئر کنڈیشنز کلینک میں داخل نہیں ہو سکتے۔۔۔ پھر میں اس کے گھر گیا مجھے دروازے سے داخل ہوتے ہوئے

شرم آئی۔ محلے کی خواتین کھڑکیوں اور دروازوں سے دیکھ رہی تھیں اور یہ سوچتی ہوں گی کہ تارڑ کے دوست اتنے غریب غرباء ہیں کہ ایسی آبادیوں اور اتنے خستہ حال مکانوں میں رہتے ہیں۔" (۳۲)

اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے نامور اہل قلم کے دنیا سے رخصت ہونے پر کالم لکھے۔ اُن کے ہر کالم میں فکری طور پر اور معنوی طور پر بھی تازگی ملتی ہے وہ پرانے اور روایتی انداز سے ہٹ کر کالم لکھتے ہیں۔ اُن کے کالموں میں جانوروں کا ذکر ملتا ہے۔ اُن کے کالموں کے مجموعوں کے نام بھی جانوروں کے نام پر ہیں۔ اکثر وہ اپنے کالموں میں جانوروں اور انسانوں کا موازنہ بھی کرتے ہیں۔ اُن کے مجموعے جو جانوروں کے نام پر ہیں اُن میں "شتر مرغ ریاست"، "اُلو ہمارے بھائی ہیں"، "گدھے ہمارے بھائی ہیں"۔ ڈاکٹر انور سدید مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

"تارڑ نے بیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں افسانہ اور انشائیہ نما کالم لکھے۔ تارڑ کی طنز تیکھی اور تلخ ہے۔" (۳۳)

مستنصر حسین تارڑ کے اخباری کالموں کے علاوہ اُن کے کالموں کے مجموعے بھی سنگ میل پہلی کیشنز کی جانب سے شائع ہو چکے ہیں۔ تارڑ کے کالموں کا ایک مجموعہ "کاروان سرائے" کے نام سے ۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آیا۔ "شتر مرغ ریاست" کے عنوان سے ایک اور مجموعہ سامنے آیا جس کو اولین مجموعے کی طرح سنگ میل پہلی کیشنز لاہور نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا۔ اسی طرح ۲۰۱۴ء میں ان کا ایک اور مجموعہ "بے عزتی خراب" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ مزید براں ہزاروں میں شکوے، الو ہمارے بھائی ہیں۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں، سمیت چک چک اور گزرہ نہیں ہوتا بالترتیب ۲۰۱۶ء، ۲۰۱۷ء، ۲۰۱۸ء، ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کے دیگر کالموں کے مجموعوں میں تارڑ نامہ سات جلدیں قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا کالموں کے تمام مجموعے ان کی دیگر تصانیف کی طرح سنگ میل پہلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئے۔

## د۔ سیاسی شعور کا تعارف :

ادیب کسی بھی معاشرے کا حساس ترین فرد ہوتا ہے۔ وہ اپنے سماج کے تمام پہلوؤں کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتا ہے۔ اُس کی نظر معاشرے کے ہر واقعہ ہر لمحے پر مرکوز ہوتی ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے تمام سیاسی،

سماجی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل پر ناصرف نظر رکھتا ہے بلکہ ان مسائل کو اپنی تحریروں کے ذریعے اُجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی بھی دور میں سیاست اور سیاسی رجحانات ہماری زندگی کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ کوئی بھی ادیب اپنے دور کے سیاسی اور سماجی، معاشرتی اور تہذیبی ماحول سے اپنے آپ کو الگ نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ادباء کی تحریروں میں سیاسی اور سماجی اور ہم عصر شعور جا بجا نظر آتا ہے۔

### ۱۔ شعور:

شعور کا لفظ عربی زبان سے ماخوذ ہے جس کے معنی آگاہی، واقفیت حاصل کرنا، سلیقہ وغیرہ کے ہیں۔ اس کے لیے انگریزی میں Awareness کا لفظ مستعمل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی قومی انگریزی اردو لغت میں لفظ شعور کے معنی کچھ یوں لکھتے ہیں:

"احساس آگاہی، وقوف علم، باشعور یا آگاہ ہونے کی حالت، کسی چیز کی داخلی حیثیت۔۔۔ ایک فرد یا عوام کے اوسط خیالات اور احساسات کا علم شعور کہلاتا ہے۔" (۳۴)

درج بالا شعور کے معنی سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ شعور کا مطلب کسی بھی چیز کے بارے میں جاننا یا اپنے ارد گرد میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے متعلق واقفیت حاصل کرنا شعور کہلاتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے شعور کے کئی پہلو ہوتے ہیں، ہم اس کے شعور کو مختلف زاویوں سے جانچ اور پرکھ سکتے ہیں۔ اُس کے ماحول میں ہونے والے تغیرات معاشی زندگی کے نشیب و فراز مادی اور سماجی حالات کے مسلسل عمل اور رد عمل سے شعور وجود میں آتا ہے اور یہی حالات اُس کے شعور کو بدلنے کا موجب بنتے ہیں۔ شعور کے متعلق احتشام حسین لکھتے ہیں:

"کسی شاعر اور ادیب کے شعور کی جستجو کئی حیثیتوں سے کی جاسکتی ہے۔۔۔ ماحول کی مادی بنیادوں سے لے کر خوابوں کی رنگارنگی تک نہ جانے کتنی منزلیں اور ہر منزل انسانی شعور پر اپنا عکس چھوڑتی ہے۔ گواصل بنیاد معاشی زندگی کے اتار چڑھاؤ سے متعین ہوتی ہے لیکن دوسرے اثرات سے بھی انکار ممکن نہیں۔ اس طرح فرد کا شعور مادی حالات اور سماجی ماحول میں مسلسل عمل اور رد عمل سے تشکیل پاتا ہے۔ کسی کے پاس بنا بنایا شعور نہیں ہوتا اور حالات بدلیں تو بدل بھی جاتا ہے۔" (۳۵)

کسی تخلیق کار کا شعور پہلے سے بنا ہوا نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنے ارد گرد ہونے والے واقعات حالات میں رونما

ہونے والے تغیرات سے اپنا شعور اخذ کرتا ہے۔ ماحول میں تغیر و تبدل اس کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ انسان ماحول کو بدلتا ہے اور اس کے بدلنے میں خود بھی بدل جاتا ہے۔ اس طرح فرد کے شعور کا مطالعہ میں اس دور کے مادی حالت و غیرہ کا مطالعہ بھی شامل ہوتا ہے۔

## ۲۔ سیاسی شعور:

جب ادیب معاشرے کی صورت حال سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ریاست اور عوام کے تعلقات پر گفتگو کرتا ہے تو اصل میں وہ اپنے سیاسی شعور کو ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ وہ نظام سیاست کا باریکی بینی سے مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی تنقیدی سوچ کے مطابق جانچتا اور پرکھتا ہے۔ اُس کے محاسن اور معائب پر بحث کرتا ہے۔ وہ سیاسی مسائل کو اُجاگر کرتا ہے۔ اس طرح کی یہ کوشش سیاسی جدوجہد میں شمار ہوتی ہے۔ اس طرح ایک فرد کا اپنی ریاست کے دستور حکومتی نظام اور ایک شہری ہونے کے ناطے سے اپنے یادگیر کے حقوق و فرائض سے متعلق آشنائی کا نام سیاسی شعور کہلاتا ہے۔

سیاسی شعور درحقیقت سیاسی واقفیت سیاسی آگاہی اور سیاسی عمل میں عوام اور ریاست کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے۔ ہر ذی فہم اور باشعور فرد کسی ناکسی عہد میں سیاسی ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ جب اس پر کسی نظریے کا اثر ہوتا ہے تو وہ اس کے سیاسی شعور کی وضاحت ہوتی ہے۔ گویا جب ادیب یا تخلیق کار اسی مرحلے سے گزر کر کوئی فن پارہ ترتیب دیتا ہے تو اس فن پارہ کی توقعات، نظریات یا کہانی کی پیشکش اور اس فن پارے کی نوعیت اس کے سیاسی شعور کی عکاسی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی سیاسی شعور کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں:

"حکومت کا ایک متعین یا باقاعدہ نظام یا انتظامی ادارہ رکھنے والا شہری حکومت اور اس کے انتظامی ادارے سے متعلق، مملکت کے معاملات یا قومی قوانین و تدابیر کے معاملات یا قومی قوانین و تدابیر میں دل چسپی رکھنے والا، کسی قوم یا مملکت یا اقوام اور مملکتوں سے متعلق ہو۔ سیاسی شعور ریاست، حکومت اور عوام کے درمیان رابطے کا نام ہے۔ جن کو بروئے کار لا کر انسانی حقوق کی حفاظت، عدل، سیاسی صورت حال کو جاننا اور معاشی نظام کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے۔" (۳۶)

ہر عہد میں انسان کو نظم و ضبط اور اپنی حفاظت کی ضرورت رہی ہے اور اسے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ رہا

ہے کہ اس کی ترقی اور حفاظت باقاعدہ سیاسی تنظیم کے علاوہ ممکن نہیں۔ گویا دور قدیم سے ہی انسانوں میں بیرونی حملہ آوروں سے بچاؤ اور ان کو زیر کرنے کے باعث سیاسی شعور نے جنم لیا۔ ارسطو بھی انسان سے متعلق اسی طرح کی بات کرتا ہے۔ سیاسیات ارسطو میں ارسطو کے مطابق "انسان فطرتاً ایک سیاسی حیوان ہے۔" (۳۷) اس سے واضح ہوتا ہے کہ انسان نے ہمیشہ اپنے حق کے لیے کوشش کی ہے۔ انسان کو اپنے تحفظ کی اور نظم و ضبط کی سوچ و فکر رہی ہے۔

قدیم عہد میں انسان نے خانہ بدوشی کی زندگی کو خدا حافظ کہہ کر ایک خاص علاقے میں سکونت اختیار کی۔ یوں ان کو کھیتی باڑی کی فکر ہوتی۔ انھوں نے کھیتی باڑی کا آغاز کیا۔ لوگوں کا ایک ساتھ رہنے کا رواج ہوا۔ آبادی میں اضافہ ہوا، جائیدادیں بنی اور حق ملکیت کا تصور اُجاگر ہوا۔ معاشی اور معاشرتی زندگی کا آغاز ہوا ان تمام حالات کی وجہ سے لوگوں میں ایک ایسی تنظیم کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا جو ان کے جان و مال کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اندرونی اور بیرونی امن و امان قائم رکھ سکے۔ اس طرح رفتہ رفتہ لوگوں کا سیاسی شعور پیدا ہونے لگا۔ جب سیاسی شعور مکمل طور پر سامنے آیا تو ریاست وجود میں آئی۔ یہ تمام حالات اور وجوہات سیاسی شعور کی تخلیق کا باعث بنے۔

قانون اور حب الوطنی کے جذبے نے سیاسی شعور کو مزید آگے بڑھایا۔ سیاسی شعور کو دنیا کی تفہیم اس میں عمل کرنے کے مختلف طریقوں کے ذریعے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس میں انسانی حقوق کی پاسداری، انصاف، معاشرتی، سیاسی اور معاشی نظام کی تفہیم اور ان کا باہمی تعلق سیاسی شعور کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ سیاسی شعور سمجھ اور سمجھ داری کا ایک ایک پیمانہ ہے۔ یہ پیمانہ سیاسی شعور کی تنقیدی جانچ پڑتال کے ساتھ ساتھ اس کی طاقت کی وسعت میں بھی نکھار پیدا کرتا ہے۔ سیاسی شعور ایک مقصد کے طور پر ہمیں بہتر زندگی کے لیے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے۔ سیاسی شعور میں بیداری کے ذریعے تو ہم پرستی کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مزید برآں سیاسی شعور ہماری انفرادی طاقت میں اضافہ کا باعث بنتا ہے اور ہمارے سیاسی مسائل کی نشان دہی میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

### ۳۔ ادب اور سیاست:

ادب کا لفظ عربی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ قدیم عربی دور میں یہ لفظ دعوت طعام کے ہم معنی تصور کیا جاتا رہا۔ ادب کے لغوی معنی دعوت، طعام، طور طریقہ، علم کا مجموعہ، اعلیٰ اخلاق، پسندیدہ تحریریں اور لحاظ وغیرہ کے

ہیں۔ شان الحق حقی کے مطابق ادب کے لغوی معنی درج ذیل ہیں:

"ادب: (اسم مذکر) تعظیم، تکریم، لحاظ، خوش اسلوبی، کسی زبان کی پائی، موضوع پر واقع عمدہ، دل پسند تحریریں، نظم و نشر کی تخلیقات اور ان سے تعلق رکھنے والی تنقیدی یا تحقیقی انشائیں ہے۔" (۳۸)

ادب سے مراد کوئی بھی تحریری مواد جس میں کسی شخص کے احساسات و مشاہدات کو جمالیاتی انداز میں بیان کیا گیا ہو۔ وہ نام جو ہم روایتی طور پر کسی بھی تصوراتی کام کو دے سکتے ہیں چاہیے وہ شعری صورت ہو یا نثری قسم، جنہیں ان کے تخلیق کاروں کی ذہنی سوچ اور فکر نے علیحدہ کیا ہو وہ مصنف اپنے تحریری کام کی بنیاد جمالیاتی حسن پر رکھے جیسے زبان، قومی نوعیت کا آغاز، تاریخی دور طریقہ وغیرہ۔

اصطلاح میں ادب سے مراد وہ تحریر ہے جو کسی شخص کے احساسات اور جذبات کے اظہار پر مشتمل ہو۔ اس میں مخصوص ضابطے اور اسلوب کو مد نظر رکھنے کا خیال رکھا گیا ہو۔ مزید برآں ادب وہ تحریر ہے جن کا تعلق عام انسانی دلچسپی سے ہو اور اس تحریر میں ایک خاص ہیئت اور اسلوب موجود ہو نیز دلکش اور فرحت بخش بھی ہو۔ گویا مواد اور ہیئت کے حسین امتزاج کا نام ادب ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے بہ موجب ادب بہ ذیل اصطلاحی مفہوم ہے:

"ادب وہ فن لطیف ہے جن کے ذریعے ادیب جذبات و افکار کو اپنے خاص نفسیاتی و شخصی خصائص کے مطابق نہ صرف ظاہر کرتا ہے بلکہ الفاظ کے واسطے سے زندگی کے داخلی اور خارجی حقائق کی روشنی میں ان کی ترجمانی اور تنقید بھی کرتا ہے۔ اپنے تخیل اور قوت مخزنہ سے کام لے کر اظہار و بیان کے لیے مؤثر پیرائے اختیار کرتا ہے جن سے سامع وقاری کا جذبہ تخیل بھی تقریباً اسی طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح خود ادیب کا اپنا تخیل و جذبہ متاثر ہوا۔" (۳۹)

کوئی بھی ادب انسانی تجربات کا نچوڑ ہوتا ہے۔ ادیب اس دنیا میں جو کچھ مشاہدہ کرتا ہے، محسوس کرتا ہے اور تجربہ کرتا ہے اسی کو دل کش الفاظ میں ادب کی شکل دے دیتا ہے۔ ادب کا وصف ہے کہ وہ اپنے دور کے بہترین خیال کو خوبصورت الفاظ میں دل کش ترتیب کے ساتھ محفوظ کرتا ہے، دراصل ادب حسین تحریروں کا جیتا

جاگتا مرتفع ہوتا ہے وہ اپنے سماج کے اور اپنے زمانے کی خوبصورتی اور دل کشی کے ساتھ عکاسی کرتا ہے۔ گویا ادب انسانی جذبات، خیالات اور اقدار کو حیات بخشنے اور بنانے سنوارنے کے ساتھ ساتھ بگاڑنے والی عظیم قوت ہے۔ سیاست کا تعلق عوام سے ہوتا ہے۔ لفظ سیاست کے لفظی معنی حکومت و سلطنت، انتظام و ملک، نظم و نسق اور ملک کی حفاظت و نگرانی کرنا کے ہیں۔ بسا اوقات سیاست حکمت و دانائی کے معنوں میں مستعمل ملتا ہے۔ سیاست عربی الاصل لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی فرہنگ تلفظ میں یوں درج ہیں: "حکمرانی، حکمت عملی، ملکی امور، مصلحت اندیشی، حصول اقتدار اور تحفظ مفادات کے لیے جدوجہد" (۴۰) اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی قومی انگریزی اردو لغت میں لکھتے ہیں:

"سیاست سے مراد حکومت کاری کا علم، کسی حکومت، قوم یا کسی مملکت کی حکمت عملیاں اور مقاصد، سیاسی معاملات، کسی شخص کے سیاسی روابط یا عقائد۔" (۴۱)

گویا سیاست انسانی زندگی کا ایک طریقہ کار ہے جو کسی علاقے، ملک وغیرہ کے کاروبار حکومت کو سنبھالنے اور سیاسی عمل کے ذریعے عوام اور ریاست کے مابین تعلق کو عیاں کرنے کا نام ہے۔ ادب کی طرح سیاست بھی انسانی زندگی کا اہم شعبہ ہے۔ عام طور پر ادب اور ادبی رویے و رجحانات سیاست سے متاثر ہوتے ہیں۔ بسا اوقات موثر ادب سیاست کو متاثر کرنے کا بھی موجب بنتا ہے۔ المختصر ادب اور سیاست کا گہرا تعلق ہوتا ہے۔

و۔ سماجی شعور:

انسان اپنی زندگی گزارنے کے لیے ایک دوسرے سے تعلقات رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں انسان مختلف لوگوں کے ساتھ روابط تشکیل دینے میں مجبور ہوتا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے دیگر مختلف اجزاء کے ساتھ تعلقات قائم کر کے ملکیت کی طرف بڑھتا ہے۔ انسان ابتداء میں الگ تھلگ رہ رہا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ اس کو اپنی ضروریات زندگی کا احساس ہوا۔ اس نے سماج کی طرف قدم بڑھائے چونکہ انسان اپنی تمام تر بنیادی ضروریات سماج سے حاصل کرتا ہے اس لیے انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات نے اسے دیگر افراد پر انحصار کرنا سکھایا۔ انسان اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسی بنیاد پر اس نے بھی انسان کو معاشرتی حیوان قرار دیا ہے۔ سماج کے بغیر انسان کے لیے زندگی گزارنا نا صرف مشکل ہے بلکہ کسی حد تک ناممکن بھی ہے۔ زندگی کے تمام امور ایک سماج کے اندر احسن طریقے سے پورے ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں

ناگہانی آفات، ماحولیاتی تبدیلیوں، مصائب و آلام اور موت وغیرہ سے انسان انفرادی طور پر مقابلہ نہیں کر سکتا بلکہ اسے اجتماعی زندگی کی ضرورت پڑتی ہے۔

انسانی زندگی کی بقا اور انسانی نسل کو آگے بڑھانے کے لیے ایک معاشرے کا ہونا لازمی امر ہے۔ اس حاجت کی بنا پر انسان نے باہم مل کر اور چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں رہنے کی ابتدا کی جو بعد ازاں ترقی کر کے معاشرے کی صورت اختیار کر گیا کیونکہ معاشرے کا آغاز اس بنیاد پر ہوا کہ انسان کو ضروریات زندگی کے اصول اور تقسیم میں آسانی پیدا ہو۔ سماج کا افراد کا ایسا مجموعہ ہوتا ہے جو مشترکہ مقاصد کے لیے آپس میں متفق اور متحد ہوں۔ یہ مقصد کئی اعتبار سے ہو سکتا ہے۔ مثلاً سیاسی، فلاحی، مذہبی، تہذیبی، ادبی وغیرہ۔ سماج ایک ایسا مقام ہے جہاں افراد اپنی رسوم و روایات، مذہب کے مطابق باہم مل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

سماج کا لفظ ہندی زبان سے لیا گیا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے society جیسا لفظ مستعمل ہے۔ لغت کے اعتبار سے سماج کے معنی علمی اردو لغت میں یوں درج ہیں: "معاشرہ، سوسائٹی، انجمن، کمیٹی، محفل، گروہ، چھتا، ٹولی، منڈی۔" (۴۲)

اصطلاح میں سماج سے مراد مل جل کر رہنا، اجتماعی زندگی جس میں افراد اپنی ترقی و بہبود اور رہنے سہنے کی خاطر دوسروں سے تعلقات استوار رکھتے ہیں۔ سماج افراد کا ایسا گروہ ہے جو مشترکہ مقاصد کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے تعاون، میل جول، رسم و رواج، روایات، مذہب اور فلسفے کے تحت زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے اصطلاحی مفہوم کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی قومی انگریزی اردو لغت میں یوں رقمطراز ہیں:

"لوگوں کا گروہ جو کسی مشترکہ مقصد کے لیے باہم متحد ہو۔ خصوصی ادبی، سائنسی، مذہبی، فلاحی مقصد یا شادمانی وغیرہ کے لیے افراد کا ربط و ضبط جیسے قوم جو باہمی مفاد اور تحفظ کے بنیاد پر منظم ہو، کسی خطے کے لوگ، یا کسی دور کے لوگ جن میں بلحاظ اطوار، رسومات یا معیارات زیست، یگانگت پائی جائے۔" (۴۳)

کسی بھی سماج کو آگے بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے لازم ہے کہ انسان اپنی فطری خواہشات سے دست بردار ہو۔ اگر انسان کسی مال و جائیداد پر ناجائز قبضہ کرے گا، یا اسی نوعیت کا کوئی اور ناروا کام کرے گا تو سماج میدان جنگ کی شکل اختیار کر لے گا۔ اسی بنا پر ہر سماج میں قاعدے قوانین تشکیل دیئے جاتے ہیں، ان کا تعین

کیا جاتا ہے۔ تاکہ انسان حدود و قیود میں رہ کر اپنی زندگی کو احسن انداز میں آگے بڑھاسکے۔ ان حدود کو پھلانگنے والے کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے۔ سماج میں افراد ایک دوسرے کی ضروریات پوری کر کے اور باہم روابط استوار کر کے زندگی کو بہتر انداز میں گزارتے ہیں۔ سماج انسانوں کے باہم تعلق اختیار کرنے کا موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ سماجی شعور سے مراد سماج سے متعلقہ عناصر کی بابت آگاہی واقفیت ہے۔ مزید برآں کسی خاص دور میں تہذیبی، علمی، معاشرتی اور فکری سطح پر واقع ہونے والے واقعات اور افکار سے آگاہی ہے۔ لفظ سماجی سماج سے نکلا ہے، جس کو اردو میں بھی استعمال کیا جاتا ہے جبکہ عربی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ سماج کا مطلب معاشرہ، گروہ، انجمن یا سوسائٹی ہے۔ جب کہ شعور کے لفظی معنی رجحان، واقفیت، تمیز وغیرہ کے ہیں۔ سماجی شعور اپنے دور کے سماج میں رونما ہونے والے واقعات، حالات، رجحانات اور تغیرات سے آگاہ رہنے کا نام ہے۔ افضال بٹ سماجی شعور سے متعلق یوں بحث کرتے ہیں:

"سماجی شعور، سماجی آگاہی اور پہچان سے عبارت ہے۔ یہاں وہ تغیر و تبدل اہم ہے جو ہمہ وقت کسی سماج میں جاری و ساری رہتا ہے اور زندگی کے نئے رخ متعین کرتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سماج کے عمومی و خصوصی رویے اور منفی و مثبت سطح پر اس کے انفرادی رویوں سے آگاہی بھی سماجی شعور کے دائرے میں آتی ہے۔" (۴۳)

اسی طرح اردو زبان کے ایک بہترین لغت اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں "معاشرتی حالات و مسائل وغیرہ کی آگاہی" (۴۴) جیسے الفاظ کو سماجی شعور قرار دیا گیا ہے۔

سماجی شعور کسی بھی سماج، اس میں موجود رواج روایات اور اقدار کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ کسی بھی سماج کے افراد مختلف نظریات و عقائد کے حامل ہوتے ہیں۔ ان افراد کے ذاتی، ذہنی اور نفسیاتی رجحانات بھی دوسروں سے الگ ہوتے ہیں۔ ان افراد کا ارد گرد مشاہدہ کرنے کا انداز اور حالات و واقعات سے اثرات قبول کرنے کا طریقہ بھی دیگر افراد سے علیحدہ ہوتا ہے۔ یہ سب باتیں افراد کی زندگی بسر کرنے کے انداز اور سماج میں ان کے طرز کی پہچان بننے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ سماج کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو اس میں ہمیں مثبت اور منفی سوچ کے حامل رویے دکھائی دیتے ہیں۔

سماج میں مثبت اقدار بھی ہوتے ہیں جو مثبت اقدار کے حامل سماج کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں

رہنے والے اگر منفی فکر و سوچ اور منفی سرگرمیوں میں ملوث رہیں گے تو اس سماج کی پہچان بھی اس طرح کی بن جائے گی۔ کسی بھی سماج پر اس کے معاشی حالات بطور خاص اثر انداز ہوتی ہے۔

ایک ایسا سماج جس میں رہنے والوں کی معاشی حالت دگرگوں ہے، ان کی اقتصادی صورت حال پس ماندہ ہے تو اس سماج میں طرز زندگی بھی اسی نوعیت کا ہو گا۔ اس سماج کی سماجی اقدار بھی اور ان افراد کے سوچنے کی صورت حال میں بھی اس کا رنگ دکھائی دے گا۔ جس معاشرے میں خوش حالی اور امن و سکون ہوتا ہے۔ وہاں کا سماجی شعور بھی اسی قسم کا ہو گا۔ خوش حال سماج میں بھی مکمل طور پر مثبت سماجی اقدار موجود نہیں ہوتی بلکہ یہ خوش حالی افراد میں حرص و ہوس جیسی منفی اقدار کے فروغ کا باعث بنتی ہے۔ معاشی لحاظ سے یہ ہوس و حرص طبقاتی تفریق کا باعث بنتی ہیں۔

دولت مند اور ثروت مند طبقہ غریب طبقے کو اپنے سے کم تر سمجھتا ہے ان کو کام کے عوض کم معاوضہ دیتا ہے۔ اس عمل میں غریب اور مزدور کی محنت اور سرمائے سے سرمایہ دار طبقے کی آمدنی میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں سماج کے ان غریب افراد کی زندگیاں اجیرن بن جاتی ہیں۔ یوں سماج میں طبقاتی کشمکش کو فروغ ملتا ہے۔ یہ طبقاتی کشمکش سماج کو متاثر کرتی ہے۔

سماج میں جنم لینے والے سماجی رویے بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ سماج میں رہنے والے افراد سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں، طبقاتی تقسیم اور طبقاتی کشمکش کے علاوہ سماجی مسائل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ہر سماج میں حساس طبقہ موجود ہوتا ہے جو اپنے ارد گرد وقوع پذیر حالات اور سماجی مسائل کی نہ صرف نشان دہی کرتا ہے بلکہ ان مسائل کے تدارک کی تدابیر بھی قارئین کے سامنے رکھتا ہے۔ سماجی شعور کی بنا پر سماج میں ہونے والی نا انصافیوں اور ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند ہوتی ہے۔ سماجی شعور افراد میں آگاہی پیدا کرتا ہے۔ یہ سماجی شعور عدم مساوات طبقاتی کشمکش اور نا انصافی کے خلاف آواز اٹھانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

سماجی شعور سے معاشرے میں ہونے والی بدعنوانی، بد اعمالیوں اور ظلم و ستم کے خلاف اقدام اٹھانے میں مدد ملتی ہے۔ سماجی شعور سے جہاں عام فرد متاثر ہوتا ہے، یہ عام فرد کے لیے اہم ہے وہیں ایک ادیب کے لیے کہیں زیادہ واقع ہے۔ سماجی شعور سے ادب کو اپنے دور سے جوڑنے کے علاوہ زندگی کے مسائل، فکری رویوں سے آگاہی فراہم کرتے ہیں۔ ادب چوں کہ زندگی کا ترجمان ہوتا ہے اس لیے ادب میں سماج کے جا بجا موضوعات کی

جھلک پائی جاتی ہے۔ سماجی شعور سماج میں مثبت تبدیلیوں کا ضامن بنتا ہے۔

## مستنصر حسین تارڑ کے سماجی شعور کا ارتقاء

ادیب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ادیب اپنے سماج سے دوری اختیار نہیں کر سکتا جس سماج میں وہ رہتا ہے۔ اُس کے حالات اور واقعات اُس سماج کا منظر نامہ اُس ادیب پر ضرور اپنا اثر چھوڑتا ہے۔ ادب چونکہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے۔ اقوام کے ماضی اُن کی تاریخ کا مطالعہ ادب ہی کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ ایک سماج اور اُس سماج کو ادب میں آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کی ذمہ داری ادیب کی ہوتی ہے۔ اب یہ ادیب پر ہی منحصر ہے کہ وہ سماج کو ادب کے ذریعے کس طرح اگلی نسل تک پہنچاتا ہے۔ ادب وہ واحد ذریعہ ہے جو قوموں کے ماضی اور حال کو محفوظ رکھتا ہے اور ایک ادیب ہی اپنے قلم کی بدولت کسی بھی سماج کی تاریخ کو محفوظ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ایک مورخ جو تاریخ لکھتا ہے۔ اُس تاریخ میں جھوٹ شامل ہو سکتا ہے مگر ایک ادب میں جھوٹ نہیں لکھا جاسکتا ہے۔ ادیب ادب اور سماج کے اس تعلق کو ڈاکٹر اشفاق احمد ورک اپنے ایک انٹرویو میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا عکاس ادیب ہوتا ہے۔ مورخ جھوٹ بول سکتا ہے۔

سیاست جھوٹ بول سکتی ہے لیکن ایک حقیقی ادیب جھوٹ نہیں بول سکتا۔" (۴۵)

ایک سچے اور حقیقی ادیب کے قلم سے اُس ادیب کی تحریروں میں اُس وقت کے سماج کی درست اور مکمل نمائندگی ملتی ہے۔ تاریخ پاکستان کی تصویر کشی علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم کی مکتوب نگاری سے پتہ چلتی ہے۔ ہندوستان کے سیاسی، سماجی حالات ہمیں غالب کی مکتوب نگاری میں بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مورخ اور ادیب میں فرق ہوتا ہے۔ ادیب پر جو بیتا ہے وہ لکھتا ہے چونکہ کسی بھی سماج کا ایک اہم فرد ہوتا ہے وہ سماج میں موجود دیگر افراد کی نسبت چیزوں کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ ادیب سماجی اتار چڑھاؤ سے دور نہیں رہ سکتا ہے اور اُس سماجی اتار چڑھاؤ کے اثرات ادیب کی شخصیت پر ہوتے ہیں۔ ان اثرات کو وہ اپنی تحریروں میں شامل کرتا ہے اور یہی سے ادب میں معاشرتی ارتقاء کی بنیادی پڑتی ہے۔ ایک ادیب ہی اپنے سماج کا بہترین ترجمان ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے لوگوں کو نا صرف حال سے بلکہ ماضی سے بھی متعارف کرواتا ہے۔ ایک ادیب جب اپنی تخلیقات میں

ماضی کا تذکرہ کرتا ہے تو گویا وہ ایک مؤرخ کا کردار بھی ادا کرتا ہے۔ (کین ولبر) نے انسانی شعور کے ارتقاء کے تین مراحل بتائی ہیں۔ ولبر کے مطابق انسانی شعور کی ارتقاء انفرادی اجتماعی تین مراحل طے کرتا ہے۔

انسانی شعوری ارتقاء کی پہلی منزل انسان کے اپنے ذاتی مفادات یا اپنی ذات ہوتی ہے۔ اس مرحلے پر انسان صرف اپنے فائدے اور نقصان کی پر فکر کرتے ہیں۔ ارتقاء کی پہلی منزل پر انسان selfish ہوتا ہے اور ارتقاء کی اس پہلی منزل کو کین ولبر کی جانب سے (Me Stage) کا نام ملا۔ پہلی منزل کے بعد شعور کی دوسری منزل میں ایک انسان اپنے ذاتی مفاد کو ترک کر دیتا ہے اور وہ دوسروں کے بارے میں سوچتا ہے۔ اپنی قوم اور اپنے لوگوں کے لیے وہ قربانی دیتا ہے۔ شعور کی اس دوسری منزل کو (USSTAGE ETHNDCENTRIC) کا نام ملا۔ شعور کی تیسری منزل پر ایک فرد اپنے خاندان اور قوم سے باہر نکل کر اس کی سوچ کا دائرہ کار پھیل کر ساری انسانیت تک پھیل جاتا ہے۔ انسانی شعور تمام افراد کے بارے میں سوچتا ہے وہ ساری انسانیت کی پھیلائی چاہتا ہے بلکہ سماج میں امن کی بھی خواہش رکھتا ہے اور پھر اس خواہش اور خواب کو عملی شکل دینے کے لیے کوشش بھی کی جاتی ہے۔ انسانی شعور اپنی تیسری منزل پر پہنچ کر ذات اور قوم سے نکل کر عالمگیریت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ تمام افراد کی بھلائی چاہتا ہے۔ انسانی شعور کی ارتقاء کی تیسری منزل پر رسائی قربانیوں کے بعد ہی ممکن ہے۔ ایک انسان اس منزل پر تب ہی پہنچ سکتا ہے جب اس کے خاندانی اور سماج کی جانب سے اس کے ساتھ مکمل تعاون اور ہمدردی ہو تعاون کے بغیر شعور کی تیسری منزل تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے۔ کین ولبر کے خیال کے مطابق انسان شعور کی دو منازل آسانی کے ساتھ طے کر سکتا ہے مگر تیسری منزل تک اُس کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُن کے خیال کے مطابق زیادہ تر انسان شعور کی پہلی دو منزلوں پر رہتے ہیں بہت کم انسان تیسری منزل تک پہنچ پاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ایک ادیب بھی ہیں اور ایک صحافی بھی ہیں۔ اُن کے ناولوں، افسانوں، ڈراموں اور کالم نگاری میں سماج کی بھرپور نمائندگی ملتی ہے۔ سماج کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات کو انھوں نے طنز و مزاح کی آمیزش کے ساتھ اپنی مختلف تصانیف کے ذریعے منظر عام پر لایا ہے اور اپنے سماجی شعور کا اظہار کیا ہے۔ سماج کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جو مستنصر حسین تارڑ کے قلم سے بچ گیا ہو۔ تقسیم پاکستان سے لے کر پاکستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کا سماج پر اثر عوام کی معاشی بد حالی دم توڑتی اسلامی روایات، ثقافت دیہی اور شہری زندگی کا موازنہ

پاکستانی سماج میں پیدا ہونے والی سماجی مسائل، افراد کے رویے، مذہب، تہذیبوں کا تصادم، ادیبوں کا تذکرہ سماجی اداروں کی کمزور ہوتی گرفت، سماجی اور اخلاقی اقدار کو اپنی تصانیف میں شامل کیا۔ سماج کے بدلتے ہوئے حالات و واقعات پر مستنصر حسین تارڑ کی بڑی گہری نگاہ ہے۔ وہ حال میں رہ کر ماضی کو ساتھ لے کر لیتے ہیں۔ وہ اکثر اپنی تحریروں میں موجودہ حالات کو بھی شامل کرتے ہیں۔ وہ سماج کو بہت باریک بینی سے دیکھتے ہیں اور سماج کے بدلتے ہوئے حالات پر اُن کی کڑی نگاہ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اپنے ایک انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ کے سماجی شعور کے ارتقاء کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"ہمارے معاشرے میں ابتدا سے لے کر آج تک جتنے بھی نشیب و فراز آتے ہیں اور جتنی بھی کروٹیں سماج نے بدلی ہیں ان سب پر مستنصر حسین تارڑ کی نگاہ ہے۔ ان نشیب و فراز پر جو رد عمل ہے وہ ایک بڑے ادیب کا رد عمل ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی نگاہ ناصرف پاکستانی سماج پر ہے بلکہ عالمی سطح پر بھی اُن کی گہری نگاہ ہے۔" (۴۶)

مستنصر حسین تارڑ کے ناول بہاؤ اور خس و خاشاک زمانے میں میں سماجی شعور بہت زیادہ ملتا ہے۔ ناول بہاؤ میں تارڑ صاحب نے انسانی تہذیب کے ارتقاء کے حوالے سے بات کی ہے کہ انسان کی ابتدائی تہذیب زراعت پر تھی بعد میں اس کا ارتقا ہوا اور ظروف سازی اس میں شامل ہوئی۔ انسانی تہذیب اور سماج کے ارتقا کا سفر جاری ہوا۔ پرانی چیزیں مٹی گئی اور نئی چیزوں نے پرانی چیزوں کی جگہ لے لی۔ خس و خاشاک زمانے میں مستنصر حسین تارڑ نے وادی سندھ کی تہذیب کو بیان کیا۔ اُن کا یہ ناول تہذیب و ثقافت، روایات اور سیاست اور انسان کی نفسیات کے گرد گھومتا ہے۔ ان کے اسی ناول میں پاکستان کی ابتدائی نازک صورت حال مذہبی انتہا پسندی، سیاسی بحران، انسانی رویے، جنگیں، تعصب جیسے سماجی موضوعات کو شامل کیا ہے۔

ڈاکٹر اشفاق احمد و رک مستنصر حسین تارڑ کے سماجی شعور کے ارتقاء کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"تارڑ صاحب کے ہاں سماجی شعور کا پس منظر دیہات اور شہر دونوں کا ہے خس و خاشاک زمانے میں گاؤں کے کلچر کو paint کیا تو اس کی کہانی کو وہ ۱۱/۹ تک لے کر آئے۔" (۴۷)

سفر نامہ نگاری سے بھی مستنصر حسین تارڑ نے ناصرف پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی رسم و رواج وہاں

کے کلچر کو موضوع بحث بنایا بلکہ جو سفر نامے انھوں نے پاکستان سے باہر کے لکھے۔ اُن سفر ناموں میں بھی مستنصر حسین تارڑ نے اُن ملکوں کے سماج کی صورت حال کو بیان کر کے اپنے سماجی شعور کی وسعت کو بیان کیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ناول، سفر نامے کے ساتھ ساتھ کالم نگاری میں بھی اپنے سماجی شعور کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ ایک کالم نگار کا براہ راست تعلق سماج سے ہوتا ہے۔ کالم چونکہ حالات حاضرہ پر ہوتے ہیں تو مستنصر حسین تارڑ نے سماج کے بدلتے ہوئے حالات اپنی کالم نگاری میں شامل کیے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور کے حوالے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں۔

"اگر ہم کالموں پر آئیں تو بہت سے ایسے کالم ہیں جو تارڑ نامہ کے نام سے سات مجموعے ہیں، الو ہمارے بھائی ہیں، گدھے ہمارے بھائی ہیں، چک چک جس میں انھوں نے سماج کے حوالے بڑی گہری بات کی ہے اور ان کے اکثر کالموں میں مسلسل معاشرتی ارتقاء ہے۔" (۴۸)

مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری کی ابتداء ۱۹۷۰ء سے شروع ہوئی جو آج بھی جاری ہے۔ مختلف اخباروں میں تارڑ صاحب نے اردو اور انگریزی کالم لکھے۔ اخبارات کے کالم اب کتابی صورت میں آچکے ہیں جو مختلف عرصے کے وقفے سے شائع ہوتے رہے۔ ان کالماتی مجموعوں میں شامل کاروان سرائے، الو ہمارے بھائی ہیں، گدھے ہمارے بھائی ہیں، چک چک، شتر مرغ ریاست، ہزاروں ہیں خواہشیں، تارڑ نامہ کے سات مجموعے شامل ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری میں سماجی مسائل افراد کے رویے، ثقافت، مذہب، سماجی ادارے، اخلاقی اقدار کی پامالی، موت، ادیبوں کے تذکرے، پاکستان کے شمالی علاقے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاحت، مختلف ممالک کے تاریخی مقامات وہاں کے مقدس مقامات اور پاکستانی سماج کی روز کی بدلتی ہوئی صورت حال کو اپنے کالموں میں پیش کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کوئی نا کوئی سماجی پہلو اپنے کالموں میں ایک کہانی کی صورت میں بیان کرتے ہیں وہ اس کہانی کے ذریعے کسی نا کسی سماجی ناہمواری کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں وقت کے ساتھ سماج کے بدلتے ہوئے حالات ملتے ہیں جیسے جیسے پاکستانی سماج کے حالات بدلتے ہیں ویسے ویسے تارڑ صاحب کے ہاں موضوعات بھی بدلتے ہیں۔ "تارڑ نامہ" مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ اُن کے اس مجموعے کے موضوعات سماج سے تعلق رکھنے والے مختلف

پہلوؤں پر ہیں۔ اخلاقی اقدار کی پامالی کو انھوں نے اپنے کالم "اکھیاں ملا کے جیا برما کے" میں بیان کیا۔ مسلمانوں کے ساتھ دنیا بھر میں اہل مغرب کی طرف سے تعصب کا جو سامنا ہے اور ان کا جو ناحق خون بہایا جا رہا ہے۔ امریکہ کا عراق اور اسرائیل کا فلسطین پر قبضہ، پاکستان کی خارجہ پالیسی، ثقافتی یلغار، پاکستانی سماج میں اقلیتوں کے ساتھ رویے، قومی زبان سے انحراف کو بیان کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا ایک اور مجموعہ تارڑ نامہ ۲ میں پاکستانی سماج کے اُس وقت کے حالات و واقعات بیان کیے گئے۔ دہشت گردی جسے مسئلہ سے دوچار سماج میں عدم استحکام اور بے حسی کو بیان کیا گیا۔ وہ اپنے ایک کالم "تین عجیب دلہنیں" اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں شہید ہونے والی تین طالبات کی کہانی کو بیان کر کے دہشت گردی کے نتیجے میں شہید ہونے والے لوگوں سے افسوس کا اظہار کیا۔ مستنصر حسین تارڑ علامتی انداز اپنا کر اس واقعے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"وہ تینوں عجیب رنگ میں دلہنیں بنی۔ مہندی تو صرف ہاتھوں پر لگائی جاتی ہے لیکن یہ عجیب گاڑے سرخ رنگ کی مہندی تھی جو ان تینوں دلہنوں کے گھائل شدہ بدنوں میں سے فواروں کی مانند چھوٹی ان کے سراپے کو رنگین کر گئی۔ انھوں نے ایک ہی روز ایک ہی وقت جبکہ وہ اسلامک یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں شریعت کے سبق حاصل کر کے کچھ دیر باتیں کرنے کے لیے بیٹھی تھی۔" (۴۹)

تارڑ نامہ ۳ میں مستنصر حسین تارڑ نے پاکستانی سماج میں درپیش سماجی مسئلہ مہنگائی کے حوالے سے کالم لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ٹی وی چینلز پر ہونے والے مارنگ شوز کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ کس طرح کے موضوعات پر وہ پروگرام پیش کر رہے ہیں اور ان شوز کے میزبان کس طرح کے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم "ایٹم بم کیسے بنایا جاتا ہے" میں لکھتے ہیں:

"ان دنوں تقریباً ہر چینل پر کمال کے مارنگ شوز ہو رہے ہیں۔ خواتین میزبان ہاتھوں میں گجرے پہنے ہاتھ نچا کر آپ سے مخاطب ہوتی ہیں۔۔۔ ان میں ارسطو اور حکیم جالینوس کی رو حیں محلول کر جاتی ہیں۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بے تھکان بولتی جاتی ہیں۔۔۔ میزبانیاں ایسی قادر الکلام ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی ان کے آگے پانی بھریں۔" (۵۰)

پہلے کے مارنگ شوز میں کوئی بہترین موضوع ہوتا تھا جس پر میزبان اپنے مہمانوں سے سوالات و جوابات

کر تا تھا مگر بدلتے وقت کے جدت نے ان اقدار کو متاثر کیا۔

۲۰۱۳ء میں مستنصر حسین تارڑ کا ایک کالمی مجموعہ "چک چک" کی اشاعت ہوئی۔ اس مجموعے میں مستنصر حسین تارڑ نے سیاست کے ساتھ سماج کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا ہے۔ سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ قارئین کی دلچسپی کو مد نظر رکھتے ہوئے اس میں مزاح کو بھی شامل کیا۔

۲۰۱۴ء میں مستنصر حسین تارڑ کے تین مجموعے سامنے آئے۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں، تارڑ نامہ ۴ اور تارڑ نامہ ۵ ہیں۔ گدھے ہمارے بھائی ہیں میں سیاسی نااہلی کو بیان کیا گیا کہ کس طرح نااہل گدھے ہمارے اداروں پر قابض ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ چونکہ زیادہ تر علامتی انداز کا استعمال کرتے ہیں۔ اس انداز کو اپنا کر وہ سیاسی اور سماجی نظام میں موجود غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہیں وہ اپنے ایک کالم میں علامتی انداز کو اپنا کر لکھتے ہیں:

"ضلع صوابی کے گدون امانی علاقے میں گدھوں نے ایک سکول کی عمارت پر قبضہ کر لیا۔ پچھلے پچاس برس سے ہم گدھوں کو ہی لفٹ کروانے چلے آتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہے۔" (۵۱)

مستنصر حسین تارڑ کا یہ کمال ہے کہ وہ مختلف موضوعات کو علامتی پیرائے میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ بے ایمانی کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "کچھوؤں کی ایکسپورٹ اور ایمانداری کی امپورٹ میں" میں بیان کرتے ہیں۔ بحیثیت قوم ہم بالکل بے ایمان ہو چکے ہیں۔ ہمارے حکمران بھی اپنی قوم کی طرح بے ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے سماج کا نظام بری طرح متاثر ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اب مجھے یہ معلوم نہیں کہ درآمد برآمد کے قوانین میں ایمانداری امپورٹ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو بھی تھوڑی سی رشوت دے کر ایمانداری امپورٹ کر لی جائے تو گھائے کا سودا نہیں۔" (۵۲)

۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آنے والا ایک اور مجموعہ تارڑ نامہ ۲ ہے۔ تارڑ صاحب کے اس مجموعے سماجی رویوں کو موضوع بحث بنایا۔ لاپرواہی مغرب پرستی اور پاکستانی فلم انڈسٹری کے لازوال کو بیان کیا۔ تارڑ نامہ ۵ بھی ۲۰۱۴ء میں منظر عام پر آیا۔ تارڑ نامہ ۵ میں مستنصر حسین تارڑ نے اپنے سفر ناموں کے ساتھ ہمارے سماج کی خامیوں کو بھی نمایاں کیا "احتجاج ایک سعی لا حاصل" کالم میں ہمارے لوگوں کی جذباتیت اور حقیقت سے دوری کو

بیان کیا ہے۔ ہم محض باتیں کرتے ہیں اور عملی طور پر کام نہیں کرتے ہیں۔ او لمپکس میں پاکستانی کھلاڑیوں کی عدم موجودگی کو انھوں نے اپنے ایک کالم "او لمپکس کے نیچے سمندر ہے" میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ او لمپکس کھیلوں کے لیے پاکستانی کھلاڑیوں کی مناسب تربیت نہیں کی جاتی ہے۔ اس خامی پر مستنصر حسین تارڑ نے اس کے ذمہ داران پر تنقید کی ہے۔

"وہ اس سمندر میں تیرتے ہوئے آئیں گے دعا کیجیے ان میں سے کوئی ڈوب نا جائے۔۔۔  
البتہ دستے کے ساتھ جو کوچ اور افسران گئے ہیں ان میں سے کوئی ڈوب جائے تو چنداں  
حرج نہیں۔" (۵۳)

۲۰۱۵ء میں منظر عام پر آنے والا مستنصر حسین تارڑ کا مجموعہ کاروان سرائے کے نام سے ہے۔ اس میں مستنصر حسین تارڑ نے مختلف ادیبوں کے تذکرے کیے۔ فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے لوگوں کو موضوع بحث بنایا۔ فیض احمد فیض "جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے" چار جوان جنازے، ظفر اقبال اور ان خاندان، خدا حافظ، مسکراہٹ، فلم سٹار ننھا کی موت کو موضوع بحث بنایا۔

۲۰۱۷ء میں مستنصر حسین تارڑ کا کالماتی مجموعے الو ہمارے بھائی ہیں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں مستنصر حسین تارڑ نے طنز و مزاح کو استعمال کر کے ہمارے سیاسی اور سماجی حالات کو سامنے لایا۔ ان سماجی اداروں پر طنز کیا گیا جو عوام کی فلاح و بہبود کے لیے قائم کیے جاتے ہیں مگر وہ اپنا مقصد بھول جاتے ہیں۔ یہ سوشل ویلفیئر کے ارادے حکومت اور عوام سے سہہ تولیتے ہیں مگر اُس کا درست استعمال نہیں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ تاریخی مقامات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ جو لین در سگاہ کے حالات بیان کیے تھے۔ شہروں کے پھیلاؤ اور انسان کی فطرت سے دوری کو بیان کیا گیا۔

۲۰۱۸ء میں تارڑ نامہ ۶ سنگ میل کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ تارڑ نامہ ۶ میں مستنصر حسین تارڑ نے سماجی موضوعات اور سیاسی موضوعات کو شامل کیا۔ مذہبی تعصب کو اپنے ایک کالم "کاریز کی اندھی مچھلیاں" میں بیان کیا دکھاوا کو "کھراب سسٹم کی کھراب نیکیاں" میں بیان کیا۔ پاکستان سیاست دانوں کے شاہانہ پروٹوکول پر تنقید اداروں کے زوال کو بیان کیا اور اپنے مختلف سفر ناموں کو اس کتاب کا حصہ بنایا۔

مستنصر حسین تارڑ کا آخری کالماتی مجموعہ "تارڑ نامہ ۷" ۲۰۲۰ء میں سنگ میل کی جانب سے شائع ہوا۔

اس مجموعے میں تارڑ صاحب نے پاکستان امریکہ تعلقات، روہنگیا میں مسلمانوں کے ساتھ مظالم، سی پیک پاکستان میں بڑھتی ہوئی میڈیا کی بے لگامی، پاکستان کی خارجہ پالیسی اور عالمی ادیبوں کے تذکرے کو شامل کیا۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اپنے ایک انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ کے اس موضوعاتی اور نثری ارتقا کے حوالے سے بیان کرتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ شروع کے کالموں میں ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے ہیں۔ کہیں پر

وہ چیزوں کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیتے جیسے جیسے ان کا فکری ارتقاء ہوا بدلتے وقت اور بدلتے

منظر نامے کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ کے کالماتی موضوعات بھی بدلتے رہے۔" (۵۴)

وقت اور بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ مستنصر حسین تارڑ کا سماجی شعور بھی ارتقا پذیر ہوتا رہا جو ان کی کالموں کے موضوعات کی تبدیلی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ ہر دور کے طالب ہیں جس کو ہم روح عصر کہتے ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں ان کے کالموں میں نظر آتی ہے۔ وقت اور حالات کے لحاظ سے مستنصر حسین تارڑ نے کالموں کے موضوعات بھی بدلتے رہے۔

### مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی شعور کا ارتقا

سیاست ہمارے سماج کا حصہ ہے ہم اسی سماج کے اندر رہتے ہیں اور اسی سماج میں رہتے ہوئے سیاست کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک ادیب جو معاشرے کے تمام افراد سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان چیزوں کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ وہ سیاست سے باہر نہیں رہ سکتا۔ وہ شاعری کرے گا تو تب بھی وہ سیاست کو کسی ناکسی حوالے سے اپنی شاعری میں ضرور لائے گا۔ وہ اپنی تخلیقات میں کہیں نا کہیں سیاست کی عکاسی کرے گا۔ مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں ناولوں، افسانوں اور کالموں میں سیاست موجود ہے۔ مستنصر حسین تارڑ تاریخ کو جانتے ہیں۔ عمرانیات کو اور انسانی نفسیات کو بھی بخوبی جانتے ہیں۔ ان کے ناول راکھ اور بہاؤ میں سیاسی شعور ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے اکثر کالموں میں سیاست پر بات کرتے ہیں اگرچہ سیاست کی جانب ان کا رجحان کم ہے مگر سیاست پر انھوں نے ضرور بات کی ہے۔ گزرتی حکومتوں کے سماج پر اثرات حکمرانوں کی عوام دشمن پالیسیوں پر انھوں نے اپنے اکثر کالموں میں تنقید کی ہے۔ وہ سیاست میں مکمل غیر جانب داری رکھتے ہیں۔ وہ کسی بھی سیاسی جماعت اور حکمران کی حمایت نہیں کرتے ہیں۔ وہ محض کسی بھی سیاست دان کے اچھے کام اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کیے

جانے والے منصوبوں کی تعریف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اپنے ایک انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

"کالموں میں بہت سے ایسے کالم ہیں جن میں سیاسی بات کو ایک خاص اینگل سے دیکھا گیا۔ وہ اپنے کالموں میں غیر جانب دار آدمی ہیں کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی لوگوں کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہیں ہے۔" (۵۵)

مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری میں سیاسی جماعتوں کے وعدے کھوکھلے دعوے حکمرانوں کی عیاشیاں ان کی نااہلی، ناجائز اخراجات، پروٹوکول، قومی خزانے سے پیسہ لوٹ کر باہر کے بنکوں میں رکھنا سیاست دانوں کی غیر قانونی حرکات بیوروکریسی اور سیاست دانوں کی کرپشن سیاسی وفاداریوں کو بدلنا، سیاسی جماعتوں کی باہمی چپقلش آمریت اور آمروں کے غلط فیصلے پاکستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات پاکستانی حکومتوں کا امریکی نواز رویہ کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کالموں میں لکھا۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کے موضوعات کے حوالے سے اپنے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

"جب ایک سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے تو اس سے سب متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ادیب جو معاشرے کا حساس فرد ہے۔ سچ کو سچ کہتا ہے اور برے کو برا کہتا ہے۔ وہ کیسے متاثر نہیں ہو سکتا، مستنصر حسین تارڑ حالاتِ حاضرہ پر بات کرتے ہیں اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات تارڑ صاحب کے سیاسی کالموں کے عناصر بنتے ہیں۔" (۵۶)

آمریت کو مستنصر حسین تارڑ بالکل پسند نہیں کرتے ہیں اور اپنے اکثر کالموں میں وہ جرنیلوں کے غلط فیصلوں پر تنقید کرتے ہیں اور ان فیصلوں پر جن کی وجہ سے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچا ہو۔ اپنے ناول راکھ میں انھوں نے جنرل نیازی پر سخت الفاظ میں تنقید کی اس کی بنیادی وجہ مستنصر حسین تارڑ کی سرزمین وطن سے گہری محبت ہے۔ اس لیے وہ سرزمین وطن کے غداروں کو کسی صورت معاف نہیں کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ایک آمر کے امر کی نواز رویے پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک کالم "چچا سام کے نام ایک اور خط" میں لکھتے ہیں۔

"پھر افغانستان میں روس کیا آئے آپ کی پاکستان کی اور ضیاء الحق کی لاٹری نکل آئی۔ آپ نے روسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے مسلمانوں میں جہاد کی اہمیت اجاگر کیا۔" (۵۷)

آمریت کو پسند نہ کرنے کی وجہ وہ آمرانہ فیصلے جن کی وجہ سے پاکستان کی ساکھ کو نقصان پہنچا اور اُن کی وجہ سے پاکستان میں دہشت گردی جیسی برائی پیدا ہوئی۔ تارڑ صاحب اس کے سخت خلاف ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اپنے انٹرویو میں آمرانہ فیصلوں پر تارڑ صاحب کی تنقید کے حوالے سے کہتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ آمریت کو بالکل پسند نہیں کرتے اور اس کی وجہ اُن کے غلط فیصلے ہیں جو نقصان دہ ثابت ہوئے۔" (۵۸)

حکمرانوں کے شاہانہ پروٹوکول کے خلاف مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں کہیں نا کہیں تنقید کرتے ہیں۔ پاکستان کا سیاسی منظر نامہ جو بھی ہو اقتدار میں جو بھی حکومت ہو اُس حکومت کا تعلق کسی بھی سیاسی جماعت سے ہو تارڑ صاحب نے ابتداء سے لے کر آج تک حکمرانوں کی ملک دشمن اور سماج دشمن پالیسیوں پر تنقید کی ہے۔ کہیں پر بھی اپنے رویے کو بدلا نہیں ہے۔ انھوں نے غلط کو غلط لکھا اور صحیح کو صحیح لکھا ہے۔ انھوں نے کسی بھی جگہ پاکستان کی کسی سیاسی جماعت کی کسی حکمران کی حمایت نہیں کی البتہ گزرے وقت اور بدلتے سیاسی منظر نامے پر اُن کے کالم اخبارات میں آتے رہے۔ شاہانہ پروٹوکول ہمارے ہاں ایک بڑا مسئلہ ہے۔ بے شک وہ آمریت کا دور ہو یا جمہوریت کا دور ہو۔ تارڑ صاحب کی جانب سے ایک کمزور معیشت رکھنے والے ملک کے وزیروں کے اس شاہانہ پروٹوکول پر تنقید ملتی ہے۔ وہ اس کو اچھا نہیں جانتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے اولین مجموعے تارڑ نامہ میں ناصرف پاکستانی سیاست پر بات کی بلکہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو بیان کیا۔ "خون ناحق کی گرمی اور گلوبل وار منگ" میں دنیا بھر میں بڑھتی ہوئی گرمی کو مسلمانوں کے ناحق بہتے ہوئے خون سے جوڑا گیا اور اس پر عرب ممالک کی خاموشی اور پاکستان کے کردار پر بات کی ہے۔ وہ اپنے ایک کالم میں مسلمان ممالک کے اس کمزور رویے پر لکھتے ہیں:

"ہم دعاؤں کے ایکسپرٹ ہیں ہر نماز کے بعد۔۔۔ حج کے دوران رورو کر دعائیں مانگتے ہیں کشمیر کے لیے فلسطین کے لیے اور دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے۔۔۔ اور پھر فارغ ہو جاتے ہیں۔ ہاں ہم دعاؤں کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔" (۵۹)

اس کے علاوہ امریکہ نواز پاکستانی حکمرانوں کا رویہ، بے جا وفاداریاں، دنیا بھر میں مسلمانوں کی زبوں حالی، پاکستانی سیاست دانوں کی حکمت عملی، خالی لاشوں پر سیاست کو موضوع بحث بنایا۔ اپنے ایک کالم میں وہ لاشوں پر

سیاست کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اب یہ ہے کہ مقتولوں کی لاشوں پر سیاست کی بساط بچھ چکی ہے اور شطرنج کے کھلاڑی آمنے سامنے بیٹھے اپنی چالیں چل رہے ہیں۔۔۔ چنانچہ شطرنج کے یہ کھلاڑی بھی افسوس شکل بنائے بیٹھے ہیں اور ب تک بیٹھے رہیں گے جب تک وہ یہ بازی جیت نہیں جاتے اور بازی جیتتے ہی وہ تھقبے لگائیں گے۔" (۶۰)

سیاسی وفاداریوں کے بدلنے پر مستنصر حسین تارڑ نے حکمرانوں پر طنز کیا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر وہ جماعتیں بدل بل کر اقتدار میں آنے اور وقت وزارت کو پورا کرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کے دو مجموعے منظر عام پر آئے جن میں تارڑ نامہ ۲ اور تارڑ نامہ ۳ ہیں۔ حکمرانوں کی کرپشن، پاک بھارت تعلقات اور دونوں ممالک کے میڈیا کا کردار بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی وفاداریوں کی تبدیلی محض اپنے ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دینے والے حکمرانوں پر طنز کیا ہے وہ اپنے ایک کالم "ہم سب ڈوڈو ہیں" میں لکھتے ہیں:

"وہ مینڈک جو حزب اختلاف چھوڑ کر حزب اقتدار کی ٹوکری میں چھلانگ لگاتے ہیں ایک ہی جست میں یہ فاصلہ طے کر لیتے ہیں پھر بڑی ڈھٹائی سے کہتے ہیں جی میں نے یہ چھلانگ ضمیر کی آواز پر کان دھرتے ہوئے لگائی وہ نوٹ جو میری جیب میں ڈالے گئے ان کی گرمی سے لگائی اقتدار حاصل کرنے کے لیے تو نہیں لگائی۔" (۶۱)

چک چک ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ کالموں کے اس مجموعے میں مختلف سیاسی رویوں پر لکھا گیا۔ "پاگلوں کو پکڑنے کا صحیح طریقہ" میں سیاست دانوں کے ہاتھوں عوام کا استحصال ان کے حقوق کی عدم ادائیگی، الیکشن سے پہلے جھوٹے وعدے اور بعد میں اقتدار میں آکر خاموشی اختیار کر لینا بیان کیا ہے۔ ایک اور کالم "آئیاں ہی آئیاں" میں "سیاسی نااہلیت کو بیان کیا ہے۔ ۲۰۱۴ء میں مستنصر حسین تارڑ کے تین کالموں کے مجموعے شائع ہوئے۔ تارڑ نمبر ۴ اور تارڑ نمبر ۵، گدھے ہمارے بھائی ہیں نام ہیں۔ کالموں کے ان مجموعہ جات میں حکمرانوں اور عوام کے درمیان دستیاب سہولیات کا تارڑ صاحب نے اپنے ایک کالم میں موازنہ کیا۔ "اچھو شیخ" نام سے ایک کالم میں علامتی انداز میں پاکستان کے خلاف اندرونی اور بیرونی سازشوں کی نشان دہی کی گئی۔ وہ لکھتے ہیں:

"پاکستان میں بھی بہت سے اچھو شیخ ہیں جو اس ملک کے گلے پر کانچ کے ٹکڑے پھیرتے اور اس عمل سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سیاست میں، فوج میں، انتظامیہ میں، مقتدر اداروں میں اچھو شیخوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔" (۶۲)

گدھے ہمارے بھائی ہیں میں تارڑ صاحب نااہل حکمرانوں کی پالیسیوں کو طنز اور علامتی انداز اپناتے ہوئے گدھا لفظ استعمال کیا۔

"آپ کسی کو گدھا سمجھ کر گھر لے آتے ہیں۔۔۔ یوں بھی وہ اتنے اہم عہدوں پر فائز ہوتے ہیں کہ انہیں آسانی سے حاصل نہیں کیا جاسکتا اگر آپ سارے گدھوں کو گدھا گھر میں لے آئیں تو ملک کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔" (۶۳)

۲۰۱۸ء اور ۲۰۲۰ء میں شائع ہونے والے مجموعے تارڑ نامہ ۶ اور تارڑ نامہ ۷ میں مستنصر حسین تارڑ نے پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بیرونی اثرات کو "ہم بے دام غلام" میں موضوع بحث بنایا۔ اس کے علاوہ ۱۹۷۱ء میں اندرونی اور بیرونی سازشوں، اقتدار کی لالچ کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور اس کے ذمہ داران کو کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔ وہ اپنے ایک کالم "زخم جو رستے ہیں" میں لکھتے ہیں:

"وہ ٹانگیر نیازی جو چوہا کہلانے کا حق دار بھی نہ تھا جب اس عظیم سانحے کے بعد ایک سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا تو لوگوں نے شیر اسلام کے نعرے لگائے۔۔۔ میری بہت خواہش تھی کہ میں اپنی زندگی میں مشرقی پاکستان میں شکست کے کسی ذمہ دار کو تختہ دار پر جھولتا دیکھوں۔" (۶۴)

مستنصر حسین تارڑ کے بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں سیاسی موضوعات بھی بدلتے ہیں، اس پہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ منظر نامے کے ساتھ ساتھ سیاسی کالم نگاری میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ شروع سے لے کر ابھی تک مستنصر حسین تارڑ کی حمایت کسی بھی سیاسی پارٹی کے حق میں نہیں نظر آتی۔ وہ صرف اُن سیاست دانوں کے اُن اچھے کاموں کی تعریف کرتے ضرور نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے ملک اور قوم کا فائدہ ہوا ہو۔ وہ براہ راست کسی سیاست دان کا نام یا کسی سیاسی جماعت کا نام کم لیتے ہیں۔ البتہ ان کے افعال کو سماجی اثرات کے ساتھ ضرور بیان کرتے ہیں۔

## حوالہ جات

- ۱۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ن ۱۳
- ۲۔ افتخار کھوکھر، محمد، تاریخ صحافت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، س۔ن۔۷
- ۳۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ن ۱۳
- ۴۔ افتخار کھوکھر، محمد، تاریخ صحافت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء، س۔ن۔۱۳
- ۵۔ محمود الحسن، مرتبہ، کشاف اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، ص۔ن ۱۸۶
- ۶۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص۔ن ۱۱۰۰
- ۷۔ English to English and Urdu Dictionary, Feroz sons, Lahore, 1987, page No 163
- ۸۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے۔ون پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۱
- ۹۔ سرفراز شاہد، کالم کلام، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۹
- ۱۰۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ن ۱۷۷
- ۱۱۔ ولیم ایل میکار، بحوالہ فیچر کالم اور تبصرہ، محمد اسلم ڈوگر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۸
- ۱۲۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۔ن ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱
- ۱۳۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے۔ون پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۵-۱۰۴
- ۱۴۔ <http://ncpulblog.blogspot.com>, Sunday, 9:31 am
- ۱۵۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۲۲
- ۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، کارواں سرائے سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۸
- ۱۷۔ محمد اسلم ڈوگر، بحر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۵۹
- ۱۸۔ شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے۔ون پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۷۲
- ۱۹۔ محمد اسلم ڈوگر، بحر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۷۸
- ۲۰۔ عبد السلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاک و ہند میں نثر، پاکستان میں اردو کالم نگاری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، نمل یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵
- ۲۱۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۳-۴۲

- ۲۲۔ محمد اسلم ڈوگر، فیچر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص ۹۵
- ۲۳۔ فرزانه سید، نقوش ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۹۸
- ۲۴۔ ایم آر شاہد، لاہور کے اہل قلم کا تذکرہ، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۴۴۷
- ۲۵۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲
- ۲۶۔ شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۳۲
- ۲۷۔ ایضاً ۳۲
- ۲۸۔ ایضاً، ص ۴۹-۴۸
- ۲۹۔ ایضاً، ص ۲۱۳
- ۳۰۔ ایضاً، ص ۲۱۴
- ۳۱۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵
- ۳۲۔ ایضاً ص ۴۶
- ۳۳۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص ۵۹۲
- ۳۴۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۱
- ۳۵۔ احتشام حسین، سید، تنقید اور عملی تنقید، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء، ص ۹۳
- ۳۶۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۰
- ۳۷۔ ارسطو، سیاسیات ارسطو، مترجم، سید نذیر نیازی، عکس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۵
- ۳۸۔ شان الحق حقی (مرتب)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵
- ۳۹۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۷
- ۴۰۔ شان الحق حقی (مرتب)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء، ص ۶۴۸
- ۴۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۱
- ۴۲۔ وارث سرہندی (مؤلف)، علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، سن، ص ۹۸
- ۴۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء، ص ۱۵۱۰
- ۴۴۔ افضل بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۱۴

- ۴۵۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲ بجے دن
- ۴۶۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۰ بجے دن
- ۴۷۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، بوقت ۱۲ بجے دن
- ۴۸۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۰ بجے دن
- ۴۹۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۲، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۸-۱۶۷
- ۵۰۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰-۹
- ۵۱۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶
- ۵۲۔ ایضاً، ص ۴۵
- ۵۳۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۵، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶
- ۵۴۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۰ بجے دن
- ۵۵۔ ایضاً
- ۵۶۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۲ بجے دن
- ۵۷۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۷۱
- ۵۸۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۰ بجے دن
- ۵۹۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۵۳-۵۲
- ۶۰۔ ایضاً، ص ۲۴۸-۲۴۷
- ۶۱۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹
- ۶۲۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۵، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۳-
- ۶۳۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹
- ۶۴۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۷، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۵۲

## باب دوم:

### مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور

دنیا کے مختلف ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان اور سماج کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے اور ان کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ اسی سماج کے اندر رہ کر انسان کی عادات بنتی ہیں۔ سماج کے بغیر انسانی شخصیت مکمل نہیں ہوتی۔ انسان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معاشرہ میں رہ کر پیدا ہوتی ہے اور پھر معاشرتی رویوں کے ساتھ پروان چڑھتی ہے اور اسی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت اور شعور نے انسان کو اشرف المخلوقات کا شرف دلویا اور خود کو تمام مخلوقات سے افضل منوایا۔ انسانی شعور بنانا نہیں ہوتا بلکہ سماج کے اندر رہ کر پروان چڑھتا ہے جیسے جیسے سماج کے حالات اور واقعات بدلتے ہیں انسانی شعور بھی اسی انداز سے بدلتا ہے۔

انسان جس سماج میں رہتا ہے، وہ کیسا ہے؟ وہ قائم کیسے ہوا؟ اور اس سے پہلے رہنے والے افراد کون تھے؟ اُن کے حالات زندگی کیسے تھے؟ اور ان افراد کے بعد آنے والے انسانوں پر کیا اثرات ڈالے۔ اس سماج کی تشکیل میں اُن کا کردار کیا رہا اور کیسے رہا اور آج کے سماج نے کن تبدیلیوں سے گزر کر موجودہ شکل اپنائی۔ سماج میں کیا ہو رہا ہے کون کون لوگ سماج کا حصہ ہیں۔ افراد کا آپس میں رویہ کیسا ہے۔ اُس سماج کے رسم و رواج کیا ہیں؟ وہاں کی ثقافت کیا ہے؟ وہاں کا اقتصادی نظام کیسا ہے؟ وہاں کی پیداوار اور تقسیم کن اصولوں پر ہوتی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی کیسا ہے؟ اور وہاں کے اداروں کی کارکردگی کیسی ہے؟ افراد کے آپسی تعلقات کیسے ہیں؟ اُس سماج کے افراد کو درپیش مسائل کیا ہیں؟ اور لوگ اُن مسائل کے بارے میں کتنے آگاہ ہیں؟ اور ان کے حل کے لیے کس حکمت عملی کے تحت کام کر رہے ہیں؟ کوئی بھی فرد جب اپنے سماج سے متعلقہ کسی بھی پہلو پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے یا اُس سماج میں موجود مسائل پر اپنی رائے دیتا ہے تو دراصل وہ اپنے سماجی شعور کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ ایک ویب سائٹ پر سماجی شعور کو یوں بیان کیا گیا ہے:

"سماجی مسائل کے بارے میں شعور کو بعض اوقات سماجی شعور کہا

جاتا ہے۔"<sup>(۱)</sup>

فرد کی سماج میں رہتے ہوئے اس سماج کے مسائل سے آگاہی ضروری ہے۔ آگاہی ہوگی تو وہ بروقت ان مسائل سے نمٹنے کے لیے اقدامات اٹھا سکے گا۔ اگر صورت حال اس کے برعکس ہے وہ سماج کے مسائل سے آگاہ نہیں ہے اگر وہ اُن پر بروقت قابو نہیں پاسکتا تو معاشرہ مزید بگاڑ کی جانب جائے گا اور اس سماج میں شامل دوسرے افراد اُس سے متاثر ہوں گے۔ قراۃ العین عاصم اپنے مقالے میں سماجی شعور کی تعریف یوں ہے:

"سماجی شعور سے مراد کسی مخصوص عہد میں معاشرتی، تہذیبی،

علمی اور فکری سطح پر رونما ہونے والے واقعات افکار سے آگاہی

ہے۔" (۲)

جس سماج کے افراد کا سماجی شعور جتنا جدید اور پختہ ہو گا اتنا ہی وہ سماج وقت کے ساتھ ساتھ ترقی کرے گا اور وہاں کے لوگ خوش حال زندگی بسر کریں گے۔ سماج میں بسنے والے عام افراد کے لیے جتنا سماجی شعور اہم ہے اتنا ہی زیادہ اس سماج سے تعلق رکھنے والے ایک ادیب کے لیے اہم ہے۔ سماج میں ادیبوں کا معزز مقام ہوتا ہے اور وہ سماج کے عام افراد میں اُن کا سماجی شعور بیدار کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایک ادیب کس طرح سماج کو اپنے تحریروں کے اندر سموتا ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے حالات اور واقعات کو وہ کس انداز سے اپنی تحریروں میں شامل کر کے وہ اپنے قارئین کے سامنے لاتا ہے۔ قیام پاکستان سے پہلے اور قیام پاکستان کے بعد بہت سے ادیبوں نے اپنی تصانیف میں سماج کو موضوع بحث بنایا۔ سماج میں پیش آنے والے واقعات معاشی عدم توازن، فسادات، خانہ جنگی، طبقاتی تقسیم، سیاسی اتار چڑھاؤ اور سماجی مسائل کو اپنی تحریروں میں لا کر دنیا کے سامنے پیش کیا۔

ادیب سماج کا اہم فرد ہوتا ہے اس کی تحریروں میں کہیں نا کہیں اُس کا سماج ضرور نظر آتا ہے۔ سماج کے افراد میں آگاہی پیدا کرنا اُس کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے اپنے سماج کی نمائندگی کی ہے۔ سماجی اور سیاسی زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف پہلوؤں کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی کالم نگاری میں غربت، دہشت گردی، افراد کے رویے، مذہب، عدل و انصاف کا فقدان، طبقاتی تقسیم، لاقانونیت، فرقہ بندی، تعصب، کمزور ہوتی ثقافتی روایات، سماجی اقدار کی پامالی، جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان موضوعات پر مستنصر حسین تارڑ نے بڑے بے باک انداز میں لکھا اور ان کے پیچھے کار فرما عناصر کی نشان دہی کی۔

۱۹۴۷ء میں پاکستان بننے کے بعد سیاسی اتار چڑھاؤ نے پاکستانی سماج کو بہت متاثر کیا۔ سیاسی طور تو بد قسمتی سے پاکستانی سماج آج تک مضبوط ناہو سکا جس کی وجہ سے معاشرے کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ جرائم کی شرح دن بدن بڑھ رہی ہے غربت، دہشت گردی اور بیروزگاری نے سماج کی جڑیں مزید کھوکھلی کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حکومتی عیاشیوں، وزراء اور اُن کی مشیروں کی فوج نے ملک کی ترقی میں کم اور اس کی تنزلی میں بھرپور کردار ادا کیا۔

## معاشرتی رویے

کسی بھی سماج میں بسنے والے انسانوں کے رویے اُس سماج کی پہچان بن جاتے ہیں۔ یہ سماجی رویے اپنے اندر بہت سے مثبت پہلو بھی رکھتے ہیں اور منفی پہلو بھی ان کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی سماج کی خوش حالی اور کامیابی کا راز اور دار و مدار ان کے مثبت رویوں پر ہوتا ہے وہی اُن کے منفی رویے اُس سماج کے زوال کی وجہ بھی بنتے ہیں۔ اور یہی معاشرتی رویے عالمی سطح پر بھی ہمارے ملک اور سماج کے اصل چہرے کا تعین کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دنیا بھر میں مسلمانوں کے بارے میں ایک تاثر پایا جاتا ہے۔ یہ لوگ مذہبی انتہا پسندی کی جانب زیادہ رجحان رکھتے ہیں اور اس وجہ سے یورپین ممالک کے کچھ حصوں میں دہشت گرد بھی کہا جانے لگا ہے۔ اس تاثر کو ہمارے ہاں منفی جذبات رکھنے والے لوگ مزید مضبوط کرنے کی وجہ فراہم کرتے ہیں۔ آئے روز ہمارے ملک میں کوئی نا کوئی ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جس پر بجائے قانون کو ایکشن لینے کے عوام قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں اور اپنی مرضی کی کاروائی کر کے اس مسئلہ کو مزید بڑھا دیتے ہیں۔ سانحہ سیالکوٹ اور مشال خان جیسے واقعات اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ ان واقعات پر قانونی کاروائی کی بجائے عوام کا ذاتی رد عمل دنیا کے سامنے ایک منفی تاثر چھوڑتا ہے اور اُن کے اس تصور کو مزید مضبوط کرنے کی وجہ فراہم کرتا ہے۔ لوگوں کے انھی رویوں کا ہی ہمارے پاکستانی سماج پر تصور دنیا کے سامنے ابھرتا ہے۔

منفی رویوں کی وجہ سے سماج کی زندگی بری طرح متاثر ہوتی ہے یہ سماج میں لا قانونیت بے رحمی ظلم و ستم اور نفرت پیدا کرتے ہیں اور یہی رویے معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ جہاں منفی رویے معاشرتی بگاڑ کا باعث بنتے ہیں وہیں مثبت رویے معاشرتی استحکام، مضبوطی، خوشحالی اور ترقی کا باعث بنتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے

کالموں میں اپنے منفرد اسلوب کے ذریعے روزمرہ کے سماجی رویوں کو بیان کیا ہے۔ اُن کے بیان کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی اہم بات کو ایک کہانی کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔

## لاپرواہی

لاپرواہی بحیثیت پاکستانی قوم ہمارے مزاج کا ایک حصہ بن چکی ہے اور اس کے نتیجے میں بہت سے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ہم مستقبل کی فکر چھوڑ کر صرف حال میں جینا چاہتے ہیں۔ وہ ضروری کام جو روزانہ کی بنیاد پر کرنے ہوتے ہیں ہم انہیں محض ایک دن یا ایک ہفتہ میں کر کے باقی پورا سال بھول جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم جس کا عنوان "جو درخت لگانا بھول گئے" میں طنزیہ انداز میں اس رویے کی نشان دہی کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"ہم دراصل ایک ہفتوں کی قوم بن چکے ہیں ہفتہ شجرکاری، ہفتہ صفائی، ہفتہ ٹریفک، ہفتہ خوش اخلاقی وغیرہ ہم ایک عہد تخلیق نہیں کرتے، کسی عادت کو ہم سرشت میں داخل نہیں کرتے بلکہ ایک ہفتہ مناتے ہیں اور پھر پورے برس کے لیے فارغ ہو جاتے ہیں۔" (۳)

عالمی سطح پر کوئی بھی دن منانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس دن کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے اور عوام کی توجہ اُس مسئلہ کی طرف مبذول کروائی جائے کہ یہ دن کتنی اہمیت رکھتا ہے اور ہمارے ہاں باقی وہ دن ماننے کے بعد پورا سال ذمہ داریوں سے سبکدوشی اختیار کر لی جاتی ہے۔ کسی بھی ملک کی ترقی کا انحصار زراعت کے ساتھ ساتھ اُس ملک کے جنگلات پر بھی منحصر ہے اور جنگلات بھی تب ہی بنتے ہیں جب ایک بڑی تعداد میں درخت لگائے جائیں اور اُن کی پورا سال مناسب دیکھ بھال کی جائے۔ ہمارے معاشرے میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دن یا ایک ہفتہ اس کے لیے مختص کرتے ہیں۔ کوئی بھی پودا بہت شوق سے لگا دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بھول جاتے ہیں کہ اس کو پانی بھی دیا جاتا ہے اور اس کی دیکھ بھال بھی کی جاتی ہے۔ ہر سال ہم اخباروں میں ایسی بہت سی تصاویر کو دیکھتے ہیں کہ فلاں صاحب پودا لگا رہے ہیں۔ اس کے بعد کوئی تصویر نظر نہیں آتی۔ اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"ہم ایک ننھے منے پودے کو زمین میں لگا کر اس پر پانی چھڑکتے ہیں اور پھر فارغ ہو جاتے ہیں۔۔۔ پودے بھی بچوں کی طرح ہوتے ہیں انہیں وقت پر خوراک ملنی چاہیے اور

دھوپ چھاؤں کا خیال رکھنا چاہیے۔" (۴)

اگر آئندہ بھی ہم اسی لاپرواہی کا مظاہرہ کرتے رہے اپنے کام میں کوتاہی کرتے رہے تو آنے والی نسلوں کو ان بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا اور یقیناً وہ اپنے بزرگوں کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کریں گی۔

## منافقت

منافقت یا دوغلا پن سماج کے لوگوں کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اُن کا ایک روپ نہیں کہیں روپ ہوتے ہیں جو وہ وقت اور ضرورت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو بظاہر معاشرے میں اپنے دکھاوے کی وجہ سے ایک معزز مقام رکھتے مگر ان کے افعال ان کے اقوال کے مطابق نہیں ہوتے۔

پاکستان میں پچھلے کچھ عرصہ میں گھریلو ملازموں پر تشدد کے بہت سے واقعات سامنے آئے ہیں۔ گھروں میں کام کرنے والے بچے اکثر غریب خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بچے اپنے غریب ماں باپ، بہن بھائیوں کا پیٹ پالنے کے لیے دوسروں کے گھروں پر کام کرتے ہیں۔ (ILO) کی ایک تحقیق کے نتائج میں یہ کہا گیا کہ پاکستان کے شہروں میں ہر چوتھے گھر میں کم سن ملازم یا ملازمہ ہوتی ہے۔ گھر میں کم عمر ملازمہ سے کام اس لیے کروایا جاتا۔ ان کے زیادہ نخرے نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ زیادہ پیسے کی طلب کرتے ہیں اور اپنے مالکوں کی بات مان لیتے ہیں۔ بچوں کے علاوہ اکثر بڑے عمر کے ملازموں کے ساتھ بھی یہ رویہ دیکھنا کو ملتا ہے۔

امیر طبقہ اپنے پالتو جانوروں پر زیادہ پیسے خرچ کرتے یا انھیں سہولیات فراہم کرتے ہیں جن سے اُن کے گھریلو ملازمین محروم ہوتے ہیں۔ امیر طبقہ کے کھانے کی میز پر اکثر اُن کے پالتو جانور ساتھ دیکھے جاتے ہیں جبکہ ان کے گھریلو ملازمین کے ساتھ غیر انسانی سلوک کے قصے میڈیا پر آرہے ہوتے ہیں۔

گھریلو ملازمین پر تشدد کرنے والے افراد سیاست دان بھی ہوتے ہیں جیسے کہ ۲۰۱۹ء میں یہ خبر منظر عام پر آئی تھی کہ پنجاب اسمبلی کی ایک رکن کی بیٹی نے اپنے گھریلو ملازم پر تشدد کیا تھا اور اسی تشدد سے اُس کی موت ہو گئی طاقت ور ہونے کی وجہ سے ایسے معاملات بعد میں سمجھوتہ پر ہی ختم ہوتے۔ گھریلو ملازمین پر تشدد کرنے والے افراد عام طور پر امیر طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں یہ لوگ بظاہر تو بڑی باتیں کرتے ہیں مگر ان کے اپنے رویے درست نہیں ہوتے۔ اسی رویے کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم میں "غریبوں سے ہمدردی کرنے والے لوگ" میں ایک کہانی کی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہمارے محلے میں بہت سی ایسی خواتین ہیں جو غریبوں کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔ میں نے اپنے مختصر باغیچے کے لیے ایک پارٹ ٹائم مالی رکھا وہ کہنے لگا صاحب جی گرمیوں میں آپ جانتے ہیں کہ دھوپ میں کام کرتے کرتے پیاس لگ جاتی ہے تو آپ ٹھنڈا پانی تو پلا ر دیا کریں گے ناں! میں نے اس درخواست پر حیرت کا اظہار کیا تو کہنے لگا صاحب جی وہ فلاں کوٹھی کی جو بیگم صاحبہ ہیں ناں، اُن کے لیے بھی کام کرتا تھا۔ ڈیڑھ سو روپے دیتی تھی اور سیزن میں سینکڑوں گملے پیسزی کے تیار کرواتی تھیں۔ صفائی بھی میں کرتا اور گھاس بھی کاٹتا تھا۔ پیاس لگتی تھی تو کسی ملازم سے پانی مانگ لیتا تھا۔ ایک روز بیگم صاحبہ نے پانی پیتے ہوئے دیکھ لیا وہ بہت ناراض ہوئی۔ کہنے لگیں میں بھی کہوں ہمارے فریج میں سے ٹھنڈا پانی کہاں چلا جاتا ہے۔ وہ تو تم سارے کا سارا پی جاتے ہو۔ آئندہ بوتل میں پانی ساتھ لایا کرو۔ مہینہ ختم ہوا میں نے تنخواہ مانگی تو بیگم صاحبہ کہنے لگی میں ایک مہینے کی تنخواہ اپنے پاس رکھتی ہوں۔ تاکہ ملازم بھاگ نہ جائے۔ اگلے مہینے انھوں نے تنخواہ میں سے سو روپے کاٹ لیے کہ تم نے پانچ گملے توڑے ہیں۔ صاحب جی گملے پرانے تھے اور پہلے سے ہی اُن میں دراڑیں تھیں۔ بہر حال میں اُس سے معافی مانگ کر آگیا۔ میں نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ تم فلاں نمبر والی بیگم صاحبہ کو جانتی ہو؟ کہنے لگی ہاں کیوں نہیں بہت نیک اور خدا ترس خاتون ہیں۔ نذر نیاز بھی دیتی ہیں اور باقاعدہ سے میلاد شریف بھی کرواتی ہیں اور غریبوں کا کہنا ہے بہت خیال رکھتی ہیں۔" (۵)

ایسے بہت سے لوگ ہیں جو کسی ناکسی این جی اوز سے تعلق رکھتے ہیں جو لوگوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں عدالتوں اسمبلیوں میں ہوتے ہیں اور اپنی لمبی لمبی تقاریر سے لوگوں کو یہ محسوس کرواتے ہیں کہ اُن سے بڑا غریبوں اور لاچاروں کا کوئی ہمدرد نہیں۔ غریبوں کا سارا درد اُن کے سینوں میں بھرا ہوا ہے۔

میڈیا کے سامنے وہ کچھ لاچار افراد کی مدد بھی کرتے ہیں تاکہ اُن کو لوگوں کی جانب سے خوب پذیرائی ملے اور لوگوں میں وہ ہمدرد مشہور ہو جائیں۔ لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹ کر وہ اپنے کاروبار کو خوب ترقی دے سکیں۔ ان میں سے اکثر لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی ذاتی ملازموں کی حالت اُن کی باتوں اور دعوؤں سے یکسر مختلف ہوتی ہے وہ اپنے ملازمین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے اُن کے پالتو جانوروں کی حالت اُن ملازمین سے بہت بہتر ہوتی

ہے۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جب یہ لوگ باہر کہیں کھانے میں مشغول ہوتے ہیں تو ان کے ملازم یا ان کے بچے سنبھال رہے ہوتے ہیں یا الگ تھلگ دور بیٹھ کر ان کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اسی حوالے سے اپنے کالم میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ ہمارے معاشرے میں بیشتر افراد اس طرح غریبوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے پالتو جانوروں سے بھی بدتر سلوک کرتے ہیں کیونکہ پالتو جانور سے آپ محبت بھی کرتے ہیں اور اس کی خوراک کا خیال رکھتے ہیں گرمی ہو تو برف کا پانی پلاتے ہیں۔ بیمار ہو جائے تو ڈنگر ڈاکٹر کی بھاری فیس ادا کر کے اس کا علاج بھی کرواتے ہیں۔ لیکن اپنے گھر اور دفتر میں کام کرنے والے چھوٹے چھوٹے ملازموں کو ان سے بھی حقیر سمجھتے ہیں گھر میں صفائی کرنے والی بیمار پڑ جائے اس کا حادثہ ہو جائے تو اسے نہ صرف لعن طعن کرتے ہیں بلکہ تنخواہ بھی کاٹ لیتے ہیں۔" (۶)

محنت مزدوری کے لیے آئے ہوئے یہ لوگ نہایت مجبور ہوتے ہیں۔ ان کی ضروریات زندگی کا خیال رکھنا اور ان کو پورا کرنا ان لوگوں کی ذمہ داری ہوتی ہے جن کے ہاں یہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔ اپنے پالتو جانوروں سے بھی پیار کریں مگر انسانوں اور جانوروں میں بھی فرق رکھے ان افراد کو ہمدردی اور پیار کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ احساس کمتری کا شکار نہ ہو اور خدا نخواستہ کسی ایسی سرگرمی میں مبتلا نہ ہو جائیں جو کل کو ہمارے معاشرے کے لیے خطرناک نتائج پیدا کرے۔ ان افراد کی مالی معاونت کرنا ان پر کوئی احسان نہیں ہے اور نہ ہی اس کو احسان سمجھ کر کرنا چاہیے بلکہ اس کو ایک فرض کی طرح پورا کرنا چاہیے۔ اس بات کو مستنصر حسین تارڑ کسی کے قول کے ذریعے بیان کرتے ہیں:

"کسی سیانے کے کہا تھا کہ آپ کسی کے مکان میں ایک ہفتہ بھی ٹھہریں تو آپ مالک مکان کو اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں اور ہم پوری زندگی اس دنیا کے مکان میں قیام کرتے ہیں اور کوئی کرایہ ادا نہیں کرتے۔ تو یہ کرایہ آپ کے ذمے ہے اور یہ حق ہے ان لوگوں کا جو رزق حلال کی جستجو میں چھوٹے چھوٹے کام کر کے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ آپ ان پر احسان نہیں کریں گے کیونکہ یہ تو دنیا کے مکان میں رہنے کا کرایہ ہے۔" (۷)

## تساہل پسندی

غیر ذمہ داری، سستی بد قسمتی سے ہمارے سماج کے لوگوں کے روزمرہ کے رویوں کا حصہ بن چکی ہے۔ ہمارے اپنے فرائض کیا ہیں ہم تقریباً ان کو بھولتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے سماج پر مشکل وقت آتا جا رہا ہے۔ روز کی بدلتی ہوئی اس دنیا میں ہمارا ملک سیاسی، سماجی حالات میں تیزی سے تنزلی کا شکار ہو رہا ہے۔ معیشت پر نظر ڈالی جائے تو ملک قرضوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ جان لیوا مہنگائی سے ہر کوئی تنگ ہے غریب کی زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ اپنے وسائل کو بروئے کار لانے سے ہم قاصر ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں ہم بہت پیچھے رہ چکے ہیں۔

ہم اپنے مسائل کو محض مذاق میں ٹال دیتے ہیں۔ کسی بھی بات پر سنجیدگی اختیار نہیں کی جاتی ہے۔ ہم اپنی تباہی کا سامان خود اپنے خود اپنے ہاتھوں سے تیار کر رہے ہیں۔ آنے والے وقت سے ہم بے خبر ہو چکے ہیں۔ ہمارے قومی ادارے ہمارے غیر ذمہ دارانہ رویے کی وجہ سے ہمارے ہاتھوں سے نکلتے جا رہے ہیں۔ کوئی بھی ہم پر مسلط ہو جائے، ہمارے ساتھ جیسا مرضی سلوک کرے ہمارے لیے جتنے مرضی مسائل پیدا کرے نا تو ہم نے ان مسائل کے حل کے لیے سوچ و بچار کرنی ہے اور نا ہی ہم نے اُس شخص کا احتساب کرنا ہے۔ کیونکہ اگر احتساب کی باری آئی تو پہلے ہمیں خود کو ٹھیک کرنا ہو گا۔ بحیثیت قوم جو ہمارے لیے سب سے مشکل کام ہے۔ ہمارے اسی غیر ذمہ دار رویے کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "دور سے لگتے تھے گدھے، گدھے ہی نکلے" میں بیان کیا ہے:

"یہ قوم کہیں نہیں جا رہی تو کیوں پوچھوں تماش بین قوم ہے جو آتا ہے تالیاں بجاتی ہے اور جو جاتا ہے اسے پتھر ماری ہے۔" (۸)

آخر کب تک ہم نے غیر ذمہ دارانہ رویے کو اپنائے رکھنا ہے کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنا ہے۔ ہم اپنی کوتاہیوں کو نصیب کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اگر کوئی غریب بھوک سے مر جاتا ہے تو یہ اللہ کی مرضی کہہ کر چپ ہو جاتے ہیں۔ ہماری لاپرواہی کی وجہ سے کوئی انسان گاڑی کے آگے آکر مر جاتا تو یہ بھی اللہ کی مرضی سیلاب زلزلہ بم دھماکے اور کسی کی نا انصافی لاپرواہی کی بھینٹ چڑ جانے والے افراد کی اموات کو ہم نصیب کے کھاتے میں ڈالتے ہیں اور اس کو اللہ کی مرضی قرار دے ہم بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔

ہم اپنی کمیوں، کوتاہیوں پر قابو پانا ہی نہیں چاہتے۔ اگر ہم اپنی گاڑی کی رفتار مناسب رکھیں تو جہ سے اُس

کو چلائیں تو ہو سکتا ہے کسی کے نصیب میں موت نا لکھی ہو۔ اگر ہم قدرتی آفتوں سے نمٹنے کے لیے بروقت اقدامات کریں تو ہو سکتا ہے ہمیں ہمارے گناہوں کی سزا لازماً موت کی صورت میں نہ ملے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ کی مرضی نہ ہو۔ ہمارے سماج کے افراد کے اسی رویہ کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "بچوں کا قتل جائز ہے" میں ایک واقعے کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ فیصل آباد سے مری جانے والی ایک بچوں کی بس جو تفریحی دورہ کی غرض سے مری آئے واپسی پر اُس گاڑی کی بریکیں فیل ہو گئیں جس سے وہ بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ بس ڈرائیور کا یہ بیان تھا کہ میں نے سب کو بتا دیا کہ بریکیں فیل ہو گئی ہیں اس حادثے میں کتنے بچوں کی جانوں کا ضیاع ہوا۔ کیا یہ ڈرائیور کی ذمہ داری نہیں تھی کہ سفر پر روانگی کے وقت گاڑی کی مناسب دیکھ بھال کر لیتا۔ لیکن ہم ایسے بہت سے واقعات کو قسمت کے کھاتے میں ڈال کر پھر کسی اگلے حادثے کے لیے خود کو تیار کر رہے ہوتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس رویے پر اپنی رائے کا اظہاریوں کرتے ہیں

"موت کا یہ دن اُن معصوم بچوں کے لیے کیوں معین تھا۔ پاکستان کے بے ایمان اور کرپٹ سیاست دانوں، بیوروکریٹس، صنعت کاروں اور عسکریت کے پرچم لہراتے لوگوں کے لیے کیوں نہ تھا۔ ظاہر ہے بچوں کی اس بس کی بریکیں روانگی سے پیشتر چیک نہیں کی گئی تھیں کسی بھی حادثے، قدرتی آفت کو نصیب کے کھاتے میں ڈال کر ہم کتنی آسانی سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔" (۹)

اپنے مسائل اور حالات سے نظریں پھیر کر دوسروں کے مسائل پر بیان بازی اور احتجاج ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ بس یہ بے کار طریقہ کار ہے کیونکہ جس سماج کے افراد ہر لحاظ سے خود کمزور ہوں جن کے اپنے احتجاج کی اپنے ملک میں کوئی اہمیت نہ ہو اُس احتجاج یا بیان بازی کا باقی دنیا پر کیا اثر پڑ سکتا۔ اپنے مسائل ہم حل کرنے کی سکت نہیں رکھتے ہیں اور یہ امید کرتے ہیں کہ ہمارے واویلے دنیا میں سنیں جائیں گے۔ ہمارے اسی غیر ذمہ دارانہ رویے کی وجہ سے ہم آہستہ آہستہ دنیا کی نظر میں اپنی اہمیت کھوتے جا رہے ہیں۔ کشمیر کو آزاد کرواتے کرواتے اپنا مشرقی پاکستان ہم نے کھو دیا۔ بلوچستان والے ہم سے خوش نہیں ہیں۔ غیروں کو سینے سے لگانے کی وجہ سے دہشت گردی سے پیدا ہونے والے مسائل کا شکار ہمارا سماج ہو چکا ہے۔ اسرائیل کے مظالم کے خلاف احتجاج تو کرتے ہیں مگر اپنے ملک میں فرقوں اور عقیدوں کے نام پر قتل ہونے والوں کے معاملے میں ہم بالکل خاموش ہوتے ہیں۔ اس

بات کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "کیا ہم تانگے ہیں" میں یوں بیان کرتے ہیں:

"بہت برس پیشتر انگلستان میں میرے ایک ترک دوست نے ہم پاکستانیوں کے بارے میں کہا تھا کہ مجھے تم لوگوں کی سمجھ نہیں آتی تم ہمیشہ دنیا کے دیگر مسلمانوں کی نسبت اپنے آپ کو اسلام کے چیمپئن ثابت کرتے رہتے ہو دوسروں کے معاملات میں اپنی ٹانگ اڑانا ایک مقدس فرض سمجھتے ہو۔" (۱۰)

یہ رویہ اختیار کرنے سے انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں نقصان صرف اور صرف ہمارا ہے۔ دوسروں کے معاملات اور مسائل میں داخل اندازی اور اپنے سے بے خبری ہمیں مزید زوال کی جانب لے جانے کا سامان ہے۔ اسی رویے کی وجہ سے ہمارے سماج کو بہت نقصان ہوا ہے اور ہو رہا ہے کیونکہ ہم اس چیز کو ترک نہیں کرنا چاہتے اور باقی دنیا کی نظر میں ہماری بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمارے اس کمزور رویے کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم میں یوں لکھتے ہیں:

"ان دنوں مجھے محسوس ہو رہا ہے وہ ترک ٹھیک کہتا تھا ہم اپنا کردار تو سنبھال نہیں سکتے اور دوسروں کو اپنے گراں قدر مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ تانگے ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ دوسروں کے معاملات میں ٹانگیں اڑانا اپنا فرض منجبی سمجھتے ہیں۔" (۱۱)

اگر ہم اس طرح دوسروں کے معاملے میں دخل اندازی کرتے رہیں گے اور ان کو مفت مشوروں سے نوازتے رہیں گے (جن کی کوئی وقعت نہیں ہی نہیں ہوتی) تو ہم اپنے مسائل کی جانب کب توجہ دیں گے۔ اور ایسا کون ہو گا جو ہماری توجہ اس کی جانب دلوائے گا۔ دنیا ہم سے بہت آگے پہنچ چکی ہے اور وہ اپنے مسائل سے آگاہ ہے۔ ہمارے احتجاج کی اور ہمارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ وقت کا تقاضا ہے کہ غیر ذمہ دارانہ رویہ ترک کر کے اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں بجائے اوروں کے معاملات میں بولیں عملی طور پر اپنے مسائل کو ختم کریں تاکہ ایک مثبت سماج کا چہرہ دنیا کے سامنے لاسکیں۔

## معاشرتی بے حسی، خود غرضی اور بے ایمانی

بدلتے وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ معاشرتی بے حسی، شخصی خود غرضی اور بے ایمانی ہمارے سماجی رویوں کا حصہ بن چکی ہے۔ حالانکہ ہمارے مذہب اسلام میں ان برائیوں سے اجتناب کا حکم ہے۔ بفضل خدا ہم

ایک اسلامی معاشرے میں ہی رہ رہے ہیں۔ مگر مذہب سے دوری اور کہیں نا کہیں مجبوری بھی ان رویوں کی پیدائش کا موجب بنتی ہے۔ اخلاقی طور پر ہمارا سماج کم زور ہو رہا ہے اور ہم اپنی بنیادی مذہبی تعلیمات سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں جو کہ ہمارے معاشرتی بگاڑ کا باعث بن رہی ہے۔ کہیں کوئی بھی حادثہ ہو جائے ہماری عوام کی یہ کوشش ہوتی کہ اس حادثے کی پوری ویڈیو پہلے بنائی جائے اور اس نتیجے میں جو نقصان ہو رہا ہے بے شک ہوتا رہے۔

کہیں کوئی لڑائی ہو یا حادثہ ہو ہمارے سماج کے لوگوں پر فرض ہو جاتا کہ اُس کے گرد ہجوم بنالیا جائے۔ کتنے ٹریفک حادثات اور لڑائی جھگڑوں میں زخمی لوگ پڑے پڑے اپنی جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ اُن زخموں کو وہاں سے اٹھا کر اُن کو طبی امداد کے ہسپتال کے لیے روانہ نہیں کیا جاتا اور لوگ بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے قریب سے گزر جاتے یا تماشہ دیکھتے ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے ہیں مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ بے حسی ہمارے رویوں کا تیزی سے حصہ بنتی جا رہی ہے۔ اس بے حسی اور خود غرضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں جہاں کوئی لاوارث اشیاء پڑی دکھائی دیں یا کوئی حکومت کی جانب سے فلاحی کاموں کے لیے وقف کیا گیا۔ میٹرل یا مشینری ہو ہماری عوام نے اُس کو مفت کا مال سمجھ کر اٹھا لینا ہے اور اس حرکت کو غلط بھی نہیں سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔

ہماری ایمان داری کا ثبوت اُس وقت سامنے آتا ہے جب پانی کے کولروں کے ساتھ پانی کا گلاس ایک لمبی زنجیر سے باندھ دیا جاتا ہے۔ باند اس لیے دیا جاتا ہے کیونکہ اس گلاس کو بھی اٹھالیتے ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ واقعی ہمارا ضمیر مکمل طور پر سوچکا ہے اور کوئی بھی غلط کام کرنے میں ہم عار محسوس نہیں کیا جاتی ہے۔ ہمارے سماج کے انھی منفی رویوں کو مستنصر حسین تارڑ نے بہت عمدگی سے ایک خاکروب کی کہانی کے ذریعے اپنے ایک کالم "جھاڑو چور اور ایک ہری شاخ" میں نشاندہی کی ہے

"ہر سویر ماڈل ٹاؤن پارک کے ڈھائی کلو میٹر طویل ٹریک پر چلتا روزانہ پارک کے چھوٹے گیٹ کے قریب سے گزرتا تھا اور میں نے کبھی غور نہ کیا کہ وہاں ہم پاکستانیوں کی ایمانداری کا ایک چھوٹا سا یادگاری نمونہ ہے اور شاید یہ ڈاکٹر انیس تھے جنہوں نے اُس کی نشاندہی کی اور کہا میں روزانہ یہاں سے گزرتا ہوں اور یہ یادگاری نمونہ دیکھ کر شرم سے

سر جھکا لیتا ہوں کہا ہم من حیثیت القوم اتنے بے ایمان ہو چکے ہیں۔ چھوٹے گیٹ کی دیوار کے ساتھ کوئی پائپ تھا اور وہاں پارک کے خاکروب کا جھاڑو پڑا تھا اور اس جھاڑو کو چوری ہو جانے سے بچانے کے لیے اُس کے گرد ایک زنجیر پڑی تھی اور زنجیر کو ایک قفل سے بند کیا گیا تھا اور یہ معمولی نہیں خاصا بڑا اور مضبوط قفل تھا۔ جب خاکروب سے اس معاملے کے بارے میں گفتگو ہوئی تو وہ کہنے لگا صاحب جی پارک والے مجھے صفائی کرنے کی تنخواہ دیتے ہیں۔ جھاڑو مجھے اپنے پلے سے خریدنا ہوتا ہے میں جھاڑو کو ڈیوٹی کے بعد گھر نہیں لے جاسکتا کہ میں بہت دور رہتا ہوں یوں بھی جھاڑو کے ساتھ مجھے کون و لیکن میں بیٹھنے دے گا۔ چنانچہ میں اپنا جھاڑو کسی جھاڑی یا درخت کی کھوہ میں پوشیدہ کر کے چلا جاتا ہوں اور پھر بھی وہ ہر دو چار روز بعد چوری ہو جاتا تھا اور یقین جانیے ہم خاکروب ایک دوسرے کے جھاڑو چوری نہیں کرتے کہ یہ ہمارے رزق روزگار کا ذریعہ ہے ہمارے جھاڑو آپ جیسے لوگ چوری کرتے ہیں چنانچہ میں نے تنگ آکر یہ تالا اور لوہے کی زنجیر خریدی اور اس پائپ کے ساتھ باندھ کر جھاڑو کو تالا لگا دیا اور اس کے باوجود مہینے میں ایک آدھ بار میرا جھاڑو پھر بھی چوری ہو جاتا ہے لوگ کسی نہ کسی طرح تالا کھول لیتے ہیں اور کچھ نہ ہو تو جھاڑو کی تیلیاں کھینچ کر لے جاتے ہیں اب میں اور کیا کروں۔" (۱۲)

یہ تو صرف ایک خاکروب کی کہانی ہے ایسی بہت سی کہانیاں ہیں جو منظر عام پر نہیں آتی۔ بے ایمانی سماج کے لوگوں میں اس قدر بڑھ چکی ہے کہ ایک معمولی جھاڑو یا گلاس ہم سے محفوظ نہیں ہے۔ ان رویوں سے ہم اپنے سماج کی جڑیں مزید کھوکھلی بنا رہے ہیں اور یہ رویے ترک نہ کیے گئے تو کل کو ہم اپنے آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر محفوظ معاشرے کا خواب ہی چھوڑ جائیں گے۔

## سماجی مسائل

کسی بھی سماج میں افراد کے منفی رویے آگے جا کر سماجی مسائل کی شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کسی بھی معاشرہ میں معاشرتی مسئلہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب اُس معاشرے میں رہنے والے افراد کی کثیر تعداد کو کسی ناپسندیدہ صورت حال کا سامنا کرنا پڑ رہا ہو۔ معاشرتی مسائل اور معاشرے کے اندر ہونے والی برائیاں بری طرح سے معاشرے کو متاثر کرتی ہیں۔ سماجی مسئلے بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ کچھ مسائل ایسے بھی ہوتے

ہیں جن کو اس سماج کے معزز افراد حل کروادیتے ہیں اور کچھ مسائل ایسے جن کی نوعیت سخت ہوتی ہے ان مسائل کو قانون اپنے طریقے سے حل کرتا ہے۔ سماجی مسئلہ ناتو کسی فرد کا ذاتی مسئلہ ہوتا ہے اور نا وہ اکیلا اُس مسئلہ کو حل کر سکتا ہے وہاں بہت سے لوگوں کو اس کے حل کے لیے اکٹھا ہونا پڑتا ہے۔ تھومس پین نے اپنی کتاب حقوق آدمی اور عقل میں لکھا: "انسان جو حقوق اپنے لیے تلاش کرتا ہے اُسے وہی دوسروں کے لیے بھی تلاش کرنے چاہیے۔" (۱۳) قرۃ العین اعظم اپنے مقالے میں سماجی مسئلہ کی تعریف یوں لکھتی ہیں:

"سماجی مسئلہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو سماج کی اعلیٰ اقدار کے زوال کا آئینہ ہوتی ہے۔ سماج سماجی مسائل سے اُس وقت دوچار ہوتا ہے جب سماج کی اکثریت آبادی ناپسندیدہ صورتحال کا سامنا کر رہی ہوتی ہے۔" (۱۴)

کسی بھی ملک یا ریاست کے لیے وہاں کی عوام بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ریاست کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنی عوام کی بنیادی ضروریات کا خیال رکھتے ہوئے اُن کو پورا کرے۔ مثال کے طور پر روزگار، عوام کی جان، مال کی حفاظت، انصاف، صحت کی سہولت، تعلیم وغیرہ جب ایک ریاست اور اُس کے ادارے وہاں کے لوگوں کی ضروریات پوری نہیں کر پاتے تو اُس سماج میں مختلف نوعیت کے مسائل بھی پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں جن کو سماجی مسائل کہا جاتا ہے۔ ایک سماجی ویب سائٹ پر بینڈ برگ کی سماجی مسئلہ کے متعلق لکھتے ہیں:

"معاشرتی مسئلہ انحراف پر مبنی رویے کا نام ہے جو لوگ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کسی خاص سمت میں معاشرے کے بتائے ہوئے حدود سے باہر ہو کر اپناتے ہیں۔" (۱۵)

معاشرتی مسائل اُس وقت بھی پیدا ہوتے ہیں جب معاشرے میں نافذ کردہ قانون سے منحرف ہوا جائے۔ معاشرتی مسائل کسی بھی سماج کے لیے خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کا بروقت سدباب ضروری ہوتا ہے تاکہ معاشرے میں امن قائم رہے اور اُس معاشرے کے افراد پر سکون زندگی گزار سکیں۔ دنیا میں بسنے والے ہر سماج کے مسائل کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے اور ان مسائل کا سامنا ہر سماج کو کرنا پڑتا ہے۔ پاکستانی سماج بھی اپنے آغاز سے لے کر آج تک مختلف قسم کے مسائل سے دوچار ہے۔

مسائل ہر معاشرہ کا حصہ ہیں لیکن زیادہ خطرناک صورت حال وہ ہوتی ہے کہ جب اُن مسائل کی طرف

توجہ نہ دی جائے اور نہ ہی اُن کے حل کے لیے بروقت اقدامات اٹھائے جائے اور اُن کے حل کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔ بد قسمتی سے پاکستانی سماج میں ماضی میں بھی ایسا ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ مسائل ہر روز بڑھتے جا رہے ہیں مگر اُن کو ختم کرنے والا رویہ نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے بے سکونی اور عدم استحکام کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے قیام کے ۷۵ سالوں میں بھی بد قسمتی سے بحرانوں سے پاکستانی سماج نکل نہیں سکا اور ہمیشہ ایک روایتی جملہ سننے کو ملتا ہے کہ پاکستان تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہا ہے جیسے حالات نظر آتے ہیں اللہ نہ کرے یہ جملہ آگے بھی سننے کو بھی ملے۔ پاکستانی سماج ایک فلاحی ریاست کے طور پر قائم ہوا تھا مگر یہ اس فلاحی ریاست کے منتظمین اس کو اصل میں فلاحی ریاست بنانے میں ناکام ہو گئے ہیں۔

آغاز سے لے کر آج تک سیاسی عدم استحکام موروثی سیاست اقتدار کی بھوک سیاسی لوٹ مار مداخلت، کرپٹ سیاستدان، شاہی افسر اور قانونی اداروں اور یہاں کی عوام نے اس سماج کو مسائلمستان بنا دیا ہے۔ غربت، دہشت گردی، ناخواندگی، فرقہ بندی، بیرونی قرضے، بدعنوانی، لاقانونیت، سیاسی اثر و رسوخ، عدم مساوات، عدم برداشت، علاقائی تعصب، مذہبی تعصب، تیسری جنس کے ساتھ غیر انسانی سلوک، عریانی، میڈیائی بے لگامی، اخلاقی اقدار کی پامالی، مغرب پرستی، غلامانہ ذہن، معدوم ہوتے رسم و رواج، غیر ذمہ داری، غیر سنجیدگی، فن اور فن کار کی ناقدری، احساس کمتری، روز بروز بڑھتی ہوئی جرائم کی شرح، قانون کے رکھوالوں کی بد معاشی، منافقت، دہرا معیار تعلیم، نااہل افراد کا قبضہ، خوشامد، رشوت، اغواء، جبری شادیاں، غیرت کے نام پر قتل یہ سب مسائل ہمارے سماج کے اندر موجود ہیں۔ باتوں کی حد تک یہ مسائل پچھلے ۷۵ سالوں حل ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں مگر بد قسمتی سے عملی طور پر ان کے حل کی طرف کوئی نہیں جاتا اور نہ ہی کوئی مؤثر اقدامات اٹھائے جاتے ہیں۔

ہر آنے والی حکومت گزشتہ حکومت کو کوسیستی ہوتی یا تو اپنی مدت پوری کرتی یا اپوزیشن کی جانب سے عدم اعتماد کا نشانہ بن کر مجبوراً اقتدار سے الگ ہو جاتی۔ اندرونی اور بیرونی سازشیں اس سماج کی جڑیں مضبوط نہیں ہونے دیتیں اور ان جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ سازشیں کبھی تو لیڈروں کی اموات کی صورت میں سامنے آتی ہیں کبھی اچانک عوام کی منتخب کردہ حکومت کو اقتدار سے راتوں رات الگ کرنے اور ثابت شدہ عدالتی مجرموں کو اقتدار کی حوالگی کی صورت میں سامنے آتی ہیں اور کبھی غیر ملکی پروجیکٹس کو رکوانے (وہ

پروجیکٹس جس نے پاکستانی سماج کی حالت بہتر ہو) اور کبھی میڈیا کے ذریعے آزاد صحافت پر وار اور اعلیٰ اقدار کی پامالی کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے زبردست اور منفرد لب و لہجہ اور کمال اسلوب بیان سے اپنے کالموں میں ان برائیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اپنے دلچسپ انداز بیان کو برقرار رکھتے ہوئے طنز و مزاح کے لبادے میں لپیٹ کر اپنے قارئین کو پیش کرتے ہیں۔ وہ ان سماجی ناہمواریوں پر کھلے انداز میں تنقید کرتے نظر آتے ہیں اور کہیں علامتی انداز کو اختیار کرتے ہوئے مسائل کے حل کی راہ میں درپیش رویوں پر تنقید کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ر مزید انداز میں روزمرہ کے سماجی اور ادبی موضوعات پر اپنے کالموں میں بحث کرتے ہیں۔ وہ کسی ناکسی سماجی مسئلے کو بیان کرتے وقت کہیں ناکہیں وہ اس کے حل کے لیے بھی تجاویز بھی دیتے ہیں۔ بڑے سے بڑا اور سنجیدہ نوعیت کے مسئلے کو عام اور سادہ انداز میں بیان کرتے ہیں۔ احمد اقبال اپنے مقالے "مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" میں لکھتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ نے ایک ماہر نباض کی طرح معاشرتی بیماریوں کی نہ صرف نشان دہی کی ہے بلکہ اُن کی دوا بھی تجویز کی ہے۔" (۱۶)

مستنصر حسین تارڑ پاکستانی سماج میں موجود مسائل کو عام انداز میں کسی ناکسی واقعہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ کرداروں کے ساتھ سماجی مسئلہ کی جانب توجہ دلاتے ہیں مثلاً خلیفہ خلفشاری اور کہیں فرقان کی زبان سے اُس مسئلہ کو بیان کرتے ہیں۔ کہیں دہشت گردی سے متاثرہ افراد کی آواز بنتے ہیں تو کہیں دہشت گردی سے بے گھر افراد کی ہجرت کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ غربت سے چور عوام مہنگائی سے تنگ بد عنوانی، عدم مساوات، امتیازی سلوک، اخلاقی اقدار کی پامالی، میڈیا کی بے لگامی، کرپٹ سیاست دانوں کی عوام دشمن پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری کے حوالے سے لکھتے ہیں: "مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں روزمرہ کے مسائل کو ہلکے پھلکے انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔" (۱۷) سماج میں خوشی و غمی پر ہونے والے واقعات، طبقاتی تقسیم، عرض یہ کہ پاکستانی سماج سے تعلق رکھنے والے ہر پہلو کو اپنے کالموں کے اندر سمویا ہے۔

بیروزگاری ہمارے سماج کا بڑا مسئلہ ہے۔ سماج میں موجود بہت سے افراد کو اس مسئلہ کا سامنا ہے۔ پاکستانی

سماج میں جیسے جیسے یہ مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ سماج کے لیے خطرات مزید بڑھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی معاشرتی بیماری ہے جو ایک اچھے انسان کو برے کاموں کی جانب کھینچ لے آتی ہے جس کی وجہ سے وہ معیاری اور اچھے راستے کو چھوڑ کر برے راستے کو اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اُس انسان کے لیے جھوٹ بولنا دھوکہ اور فریب دینا ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہونا جس سے ملک اور قوم دونوں کو نقصان ہو ایک معمولی اور عام سی بات ہے۔ وہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے لوٹ مار کرتا ہے۔ ہر ناجائز ذریعہ استعمال کرتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اُس کی ذات کو نقصان ہوتا ہے بلکہ سماج میں موجود دوسرے افراد بھی شدید اذیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ بے روزگار افراد کے پاس باعزت زندگی گزارنے اور اپنی جائز ضروریات پوری کرنے کا جب کوئی راستہ نہیں بچتا تو بعض اوقات وہ ملک دشمن عناصر کے ساتھ مل جاتے ہیں اور ایسی کاروائیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں جس سے سماج کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

ہمارے پاکستانی سماج میں یہ مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ بہت سے پڑھے لکھے نوجوان جنھوں نے اپنا مستقبل بنانا ہوتا ہے وہ اپنی ڈگریاں اٹھائے سڑکوں پر بے روزگار گھوم رہے ہوتے ہیں۔ انہیں نوکریاں نہیں ملتی وہ مجبوری کے تحت کوئی نا کوئی چھوٹا موٹا کام کر رہے ہوتے ہیں جس سے اُن کا گزر بسر مشکل ہو جاتا ہے اور وہ مطمئن نہیں ہوتے۔ ایسے بہت سے پڑھے لکھے نوجوان ان پڑھ افراد جو مناسب روزگار نہ ہونے کی وجہ سے سماج میں ایک اچھا مقام حاصل نہیں کر پاتے اپنی اس حالت سے تنگ آکر وہ غلط راستہ اختیار کرنے کا سوچنے میں اور بہت سے افراد ان راستوں پر چل پڑتے ہیں جن پر چل کر آگے اُن کے لیے مسائل موجود ہوتے ہیں بعض افراد اپنے گھریلو اخراجات برداشت نہیں کر پاتے وہ اپنے بال بچوں کا پیٹ نہیں پال سکتے۔ اُن کی تعلیم کے اخراجات زیادہ ہونے کی وجہ سے پورے نہیں ہو پاتے جس کی وجہ سے اُن کے گھروں کے چولہے بند ہو جاتے ہیں اور نوبت فاقوں تک پہنچ جاتی ہے ایسے افراد اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کوئی غلط طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ انہی میں سے ایک راستہ غیر قانونی طور پر سرحد پار کر جانا ہے۔ کیونکہ قانونی طور پر جانے کے لیے اُن کے پاس روپے پیسے نہیں ہوتے ہیں ایسے افراد کسی نا کسی ایجنٹ کی باتوں میں آتے ہیں اور اُن کو اپنے مسائل کا حل اس میں نظر آتا ہے۔ وہ غیر قانونی طریقے سے کسی دوسرے ملک کی سرحد پار کر جائیں۔

سرحد پار کر جانے والوں کے لیے الگ ہی مسائل اُن کے منتظر ہوتے ہیں۔ دن رات وہ پولیس سے چھپتے

پھرتے ہیں پکڑے جانے کے ڈر سے وہ زندگی کے بدترین دن گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ انھیں لوگوں میں سے کچھ لوگ سمندروں میں ڈوب جاتے ہیں۔ اپنے ملک میں بے روزگاری کی بھینٹ چڑھ کر اپنے خوابوں کی تکمیل کی راہوں میں مر جاتے ہیں اور زندہ بچنے والے افراد مسائل کی دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے جو لوگ پکڑے جاتے ہیں وہ ساری زندگی جیلوں میں گزار دیتے ہیں اور کچھ کے ساتھ ایجنٹ دھوکہ کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی جمع پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ غیر قانونی طریقہ کار کو اختیار کر کے سرحد پار کرنے والے لوگوں کے ان مسائل کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم جس کا عنوان ٹوبہ ٹیک سنگھ سے سوئٹزر لینڈ تک ہے ایک کہانی کی صورت میں انہی افراد کی زبان سے بیان کیا ہے۔ اس پورے عمل کے دوران ان کو کون سے مسائل رہے اور اب وہ کیسی حالت میں ہیں اور اپنے پیاروں سے دور ہو کر کن مسائل میں ہیں:

"صبح ہوئی تو میں نے دیکھا دس پاکستانی ایک ہی بستر پر بیٹھے ہوئے بے حد خوف زدہ اور ڈرے ہوئے ہیں۔ آہستہ باتیں کر رہے تھے اور اپنا سامان سمیٹ رہے تھے ان کی داڑھیاں بڑھی ہوئی تھیں اور چہرے زرد تھے تھکے ہوئے پڑمرہ اور سہمے ہوئے خراساں خرگوشوں کی طرح بار بار دروازے کی طرف دیکھتے۔ آپ پاکستانی بھرا ہو۔ کہاں کے رہنے والے ہو ویزے پر آئے ہو پیسے دے کر یا۔۔۔۔۔" (۱۸)

انہیں دس پاکستانیوں میں سے ایک فرد کی داستان کو مستنصر حسین تارڑ یوں بیان کرتے ہیں:

"ہم ایجنٹ کے ساتھ ہیں جناب بیس بیس ہزار روپے دیے ہیں قرض لے کر رقم ادا کی ہے اپنی بھینسیں بیچی ہیں اور زمین فروخت کی تھی ایجنٹ ہمیں جہاز پر بٹھا کر استنبول لے آیا وہاں سے یہاں تک ہم غیر قانونی ہیں ہمیں ایک مہینہ ہو گیا ہے وہاں سے چلے ہوئے قسم لے لو جو ہم نے ایک وقت بھی رجھ کے روٹی کھائی ہو ہم سب بھوکے ہیں اور لوگوں سے مانگ کر کھا لیتے ہیں۔" (۱۹)

بعض اوقات ایجنٹ جو ان افراد کو دوسرے ممالک غیر قانونی طریقہ سے لے کر جاتے ہیں وہ ان کو مسائل میں ڈال کر خود غائب ہی ہو جاتے ہیں اور ان افراد کو ایسے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"بیروت میں ایک ایسے ہی پاکستانی گروہ سے ملاقات ہوئی جنہیں ایجنٹ کویت پہنچانے کے وعدے پر وہاں لایا اور پھر انٹرپورٹ پر ہی غائب ہو گیا۔ پاکستانی سفارت خانے نے اُن کی مدد کی۔" (۲۰)

وہ افراد جن کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر یہ لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اصل میں پرائے دیس میں رہ کر ان کو بھی بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہوتا ہے وہ کس حال میں جیتے ہیں یہ اُن سے بہتر کوئی نہیں جانتا۔ یہ قیمتی اشیاء جن سے گھروں کی سجاوٹ کی جاتی ہے کون جانے یہ کتنی تکالیف اور مصیبتوں کے بعد اُن کو نصیب ہوتی ہیں۔ اپنے وطن اپنے سماج میں تمام ضروریات زندگی آسانی سے میسر ہوں تو انسان اپنوں کے درمیان ہی خوش رہتا ہے۔

## بد عنوانی

کوئی بھی ایسا کام جو منصفانہ طریقوں کے برعکس کیا جائے وہ بد عنوانی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ بد عنوانی میں اپنے عہدے کا ناجائز استعمال رشوت دے کر کام کروانا یا کوئی بھی کام کرنے کے لیے کچھ وصول کیا جائے بد عنوانی میں آتا ہے۔ بد عنوانی ایک ایسی لعنت ہے جو معاشرے کی بنیادوں کو ہلاک رکھ دیتی ہے اور معاشرے میں موجود افراد میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ بد عنوانی سے معاشرے میں دیگر برائیاں جنم لیتی ہیں لوگ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔ ٹیلنٹ کی قدر ختم ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے لوگ برائیوں کی جانب مائل ہوتے ہیں اور مایوسی کا شکار ہوتے ہیں۔ انگلش آکسفورڈ ڈکشنری میں لفظ کرپشن کی یوں وضاحت ملتی ہے:

“Dishonest or fraudulent conduct by those in power, typically involving bribery the journalist who wants to expose corruption in high places.” (۲۱)

کرپشن کے مفہوم میں وسعت پائی جاتی ہے اور اس کی مختلف اشکال ہیں۔ کرپشن نہ صرف افراد اور اداروں میں ہوتی بلکہ بیرونی قوتیں بھی اپنے مقاصد حاصل کرنے کے لیے کرتی ہیں۔ اس کی اشکال میں سیاسی کرپشن، عدالتوں میں کرپشن، تعلیمی اداروں میں کرپشن، بیوروکریسی حتیٰ کے مذہبی اداروں میں بھی اس کی مثالیں سامنے آرہی ہیں۔ کرپشن ہمارے پاکستانی سماج کا ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکی ہے اور دن بدن اس کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں۔ ایک اخبار میں نیب کے چیئرمین کا یہ بیان شائع ہوا کہ پاکستان میں روزانہ کی بنیاد پر ۱۵ ارب کی

کرپشن ہوتی ہے۔ پاکستان میں اعلیٰ عہدے رکھنے والوں سے لے کر عام ملازمین تک اس مرض میں بری طرح مبتلا ہو کر ملک اور قوم کے لیے نقصان کر رہے ہیں۔

عدالت میں انصاف ایک غریب کے لیے مشکل ہو رہا کیونکہ عدالتوں کو خرید لیا جاتا اور اس کا ثبوت عدالتی ثابت شدہ مجرموں کا سرعام گھومنا ہے یا بیرون ملک فراری ہے۔ اس کے علاوہ شعبہ تعلیم، شعبہ طب، شعبہ سیاست، محکمہ پولیس، رشوت، بنکوں کی کرپشن، صحافت میں کرپشن، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، کھیلوں کے میدان میں کرپشن اور ان کے اداروں میں کرپشن، ملک میں بیرونی ممالک کی طرف سے کرپشن بجلی و گیس کی چوری ملازمتوں کی خرید و فروخت حتیٰ کے ہمارے ادارے میں کرپشن رچ بس گئی ہے اور اس کا ذمہ دار نہ صرف اُس ادارے کا سربراہ ہوتا ہے بلکہ اُس کی پوری ٹیم ہوتی ہے۔ پچھلے کچھ وقت میں مقابلہ کا امتحان منعقد کروانے والے ایک ادارے کا سینیڈل منظر عام پر آیا جس میں اس بات کا انکشاف ہوا ہے چھوٹی بڑی ملازمتیں کروڑوں روپے کے عوض فروخت ہو رہی ہیں یہ تو ایک ارادے کی کرپشن منظر عام پر آئی ایسے کئی ادارے ہیں جن کی کرپشن کی کہانیاں منظر عام پر آتی ہی نہیں ہیں اور اگر آتی بھی ہیں تو ان کے خلاف بات کاغذی کارروائی سے آگے نہیں بڑھ پاتی کیونکہ انصاف کے ٹھیکیدار خود کرپٹ ہوتے ہیں۔

یہاں کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ کی بات ہو میرٹ کی دھجیاں اڑتی نظر آتی ہیں اثر رسوخ کے استعمال سے داخلے ہوتے ہیں وہ لوگ جو اہل ہوتے ہیں ان کو نہیں ملتے اور اس کے نتیجے میں نااہل لوگ ان تعلیمی اداروں سے تیار ہو کر مختلف اداروں میں جا کر دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ بجلی و گیس کی چوری عام ہے۔ اکثر گھروں میں وہ میٹر استعمال ہوتے ہیں جن میں کم بل آتا ہے اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بجلی کے بل ادا نہیں کرتے۔ ان لوگوں میں سیاست سے تعلق رکھنے والے شخصیات بھی شامل ہیں۔ محکمہ پولیس تو اس حوالے سے کافی مشہور حیثیت رکھتا ہے۔ بات چاہے ٹریفک پولیس کی ہو یا کسی دوسرے شعبے کی دونوں ہی اس برائی کا شکار نظر آتے ہیں۔

پاکستان کے قومی ادارے اگر پی آئی اے کی بات کریں۔ ایک وقت تھا یہ شعبہ بہترین تھا اور مناسب سہولیات کی وجہ سے لوگ اس میں سفر کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ آج اسی کرپشن کی وجہ سے اس کی تباہ حالی سب کے سامنے ہے۔ کراچی سٹیبل ملز، ریلوے کا شعبہ بھی بری طرح مفلوج ہو چکا ہے۔ یہ ادارے کرپشن کی وجہ سے

اپنی حیثیت کھو رہے ہیں اور ان اداروں میں کام کرنے والے لوگ آہستہ آہستہ فارغ ہوتے جا رہے ہیں۔ محکمہ تعلیم میں ضرورت سے زیادہ افراد کی بھرتیاں اور ان کا سیاسی اثر رسوخ ایک الگ ہی کہانی رکھتا ہے۔ ایک سکول میں جہاں بچوں کی تعداد ۳۴-۳۵ تک ہے۔ چار چار استاد وہاں پڑھاتے ہیں۔ کئی کئی سکول صرف ریکارڈ میں موجود ہیں مگر اصل میں وہ ختم ہو چکے ہیں مگر سرکاری ملازمین ٹیچر کی تنخواہیں باقاعدگی سے جاری ہیں۔ جہاں ایک فرد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تین لوگ موجود ہوتے ہیں اور کام نہیں کرتے صرف سارے دن دفاتروں میں بیٹھ کر شام کو گھروں میں جاتے ہیں۔ بدعنوانی میں ہماری سیاست کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ وزیروں مشیروں کی فوج اُن کے ناجائز اخراجات پورے پورے خاندانوں کے ملکی خزانے سے دورے، سرکاری گاڑیوں میں ناصرف انسانوں کی بلکہ جانوروں کی سیر اُن کے ذاتی پروٹوکول پر اربوں روپوں کے اخراجات، کرپشن کے ذریعے ناجائز پیسہ غیر ملکی بنکوں میں منتقل کرنا بیرون ملک فلیٹ خریدنا ہوٹل بنانا اور راتوں رات اپنے کیسیز غائب کروانا اور جہاں کہیں پکڑے جانے کا خوف ہو وہاں قدرتی حادثات کروادینا اور ایمان دار افسروں کے قتل کو طبعی اموات کا رنگ دینا ہماری سیاست کا حصہ ہے۔ شمشاد احمد اپنے ایک کالم میں اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"کوئی اور ملک اس روایت سے بھی واقف نہیں ہو گا کہ بڑے قرض نادہندگان اور اعلیٰ سطح پر موجود قومی دولت کے جانے مانے لٹیروں کو باقاعدہ معافی دی جاتی ہو۔ کسی اور ملک میں مراعات یافتہ لوگ اس قدر بے حیائی کے ساتھ قانون سے بالاتر نہ ہوں گے۔ بدترین امر یہ ہے کہ بدنام زمانہ این آر او اب ہماری کرپٹ اشrafیہ کے لیے نئے نظریات کی شکل اختیار کر چکا ہے اور ہمارے ملک میں اب اسی کی حکمرانی ہے۔" (۲۲)

ہمارے سیاست دانوں کی بدعنوانیاں دنیا کے سامنے ہیں۔ اپنے دور حکومت میں وہ قانون میں اتنی ترامیم کرتے ہیں کہ قانون اُن کے لیے ڈھال کی حیثیت اختیار کرنے لگتا ہے۔ وہ جب چاہتے ہیں اور آسانی سے دوبارہ ملک میں آجاتے ہیں اور عوام روایتی ذہنی غلامی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن کو قبول کرتی ہے۔ شمشاد احمد اس بارے میں لکھتے ہیں:

"جانے بوجھے لٹیروں، منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے لیے دنیا بھر میں اتنی محفوظ پناہ گاہ اور کوئی نہیں ہو سکتی جتنی ہمارے ملک میں ہے۔" (۲۳)

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم جس کا عنوان "چوروں کے دل دھک دھک کیوں نہیں کرتے" میں واضح انداز میں معاشرے کی اس برائی کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ سوال تو بہت عام ہے کہ چوروں کے دل دھک دھک کیوں کرتے ہیں مجھے اس سوال نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ ایک صاحب آئے انھوں نے بتایا کہ رات کے اندھیرے میں چور بہت اطمینان سے گاڑی سے ٹیپ ریکارڈ نکال کر لے گئے۔ اُن صاحب کے جانے کے بعد میرا بیٹا آیا اور کہنے لگا جو لوگ دوسروں کی چیزیں اٹھا لیتے ہیں اور اُن کا ناجائز استعمال کرتے ہیں اُن کو کیوں کچھ نہیں ہوتا۔ اُن کا دل دھک دھک کیوں نہیں کرتا جبکہ میں امی سے چھپ کے دن کے وقت بسکٹ چرالوں تو دل دھک دھک کرتا ہے۔

ایسے چور جن کے دل غلط کام پر دھڑکتے نہیں ہیں ہمارے سماج میں موجود ہیں ہمارے ہر شعبے میں اُن لوگوں کی موجودگی بدعنوانی کو جنم دیتی ہے۔ کھیلوں کے شعبے میں کرپشن عام ہے کھلاڑیوں کی سلیکشن بعض اوقات بدعنوانی کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اس طرح اور محکموں کے اندر ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جو دوسرے لوگوں کا حق کھاتے ہیں اور اپنی ناجائز ضروریات پوری کرتے ہیں اور اُن کو پورا کرنے کے لیے انتہائی غلط طریقہ کار اختیار کرتے ہیں مگر پھر بھی اُن کے دل دھک دھک نہیں کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ پاکستانی سماج میں موجود مختلف اداروں کی اس بدعنوانی کو بڑے بے باک انداز سے بے نقاب کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"بجلی والا کہتا ہے آپ میرے ساتھ ٹھیکہ کر لیجیے آپ کا بل ماہانہ تیس روپے آئے گا۔ پانی والا بھی اس قسم کی آفر کرتا ہے۔ افسر ٹھیکیدار کو کہتا ہے کہ اس ٹھیکے میں سے میری کوٹھی نکلی چاہیے ٹیکس والے کہتے ہیں کہ اتنے لاکھ ہمارے اور آپ کو اتنے لاکھ کی چھوٹ، پولیس مک مکا کے چکر میں ہوتی۔" (۲۴)

یہ حال ہمارے اداروں میں موجود افراد کا ہے۔ اربوں روپے کی کرپشن اداروں کے زوال کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس کرپشن کے نتیجے میں ملک بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے۔ مگر بدعنوانی کم نہیں ہوتی ہے۔ سیاست دانوں کی بھرپور کوششوں سے ہمارا ملک کرپشن میں ن ڈوب کر آہستہ آہستہ اپنے اداروں سے ہاتھ دھو رہا اور اُن کو آئی ایم ایف کے پاس گروی رکھنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ہمارے سیاست دانوں افسروں اور عام آدمیوں کے ان رویوں کو نمایاں کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"سیاست دان کہتا ہے کہ بس پاکستان اب ختم ہونے والا ہے، بے ایمان، بد معاش، چور، قاتل اس ملک کو اور اس ملک کے باشندوں کو کھارہے ہیں سب کے سب آرام کر رہے ہیں اور ان کے دل نہیں دھڑکتے۔ کیس کا فیصلہ تمہارے حق میں ہو گا کتنا لگاؤ گے۔۔۔ ٹیم میں سلیکٹ ہونا ہے ناں کتنے پیسے دو گے۔ بٹاک سے دو بھرے ٹرک لے آؤ کسٹم پر میں انتظام کر لوں گا۔" (۲۵)

ایک زندہ قوم کا دل یہ سب کرتے ہوئے کیوں نہیں دھڑکتا دھک دھک کی آواز کیوں نہیں آتی ہمارا ضمیر اس قدر مردہ ہو چکا ہے کہ ہم اپنا نقصان اپنے ہاتھوں سے کر رہے ہیں اور کروا رہے ہیں مگر مکمل خاموشی چھائی ہے۔ اگر یہ خاموشی سے کھانے والی منصوبہ بندی جاری رہی ہم پر کرپٹ حکمران بار بار مسلط ہوتے رہے اگر ہمارا ملک بیرونی قرضوں کے بوجھ تلے دبا رہا اور ہمارا قانون اور اس کے منتظمین اپنی کرپشن کے چکر میں یوں ہی ملک دشمن اور سماج دشمن عناصر کا ساتھ دیتے رہے اور اگر ہمارے دلوں نے دھک دھک نہ کیا تو وہ دن دور نہیں جب ملک دیوالیہ ہو جانے کے قریب ہو گا ملک دشمن عناصر اس ملک کو اپنی پالیسیوں سے کمزور کرتے رہے۔ ہمارے حکمرانوں اور ہماری عوام نے ہوش کے ناخن نہ لیے تو ہمارا سماج بکھر نے سے کوئی نہیں بچائے گا۔

## قانون کا دوہرا معیار

قانون معاشرے میں امن و امان قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ انصاف پسند سماج میں معاشرے میں رائج قانون امیر اور غریب سب کے لیے برابر درجہ رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی سماج قانون کے بغیر اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہر سماج میں زندگی کے تمام معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے کچھ اصول و ضوابط کالا گونا گونا ضروری ہوتا ہے اور سماج صحیح معنوں میں تبھی ترقی کی منازل طے کر سکتا ہے جب سماج میں رائج قانون مضبوط ہو گا اور اس پر عمل ہو گا۔ رابعہ رحمن اپنے کالم میں قانون کی اہمیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

"کوئی بھی معاشرہ اُس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک وہاں امور زندگی چلانے کے لیے ضروری قوانین نابنائے جائے۔" (۲۶)

ہر معاشرے میں قوانین پر عمل وہاں کے ہر فرد کے لیے لازمی ہوتا ہے۔ جب کوئی فرد یا ادارہ قانون کی خلاف جا کر کوئی کام کرے۔ جس سے سماج کے اندر بگاڑ پیدا ہو قانون اُس کو سزا دیتا ہے۔ معاشرے میں امیر اور

غریب دونوں طبقات بستے ہیں معاشرے میں قانون اُس وقت تک مضبوط رہتا ہے جب عملی طور پر یہ دونوں طبقات کے افراد کے لیے کام کرتا ہو۔ امیر طبقہ اکثر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمزور افراد پر ظلم کرتے ہیں، اُن کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے ہیں اور قانون کی پکڑ سے بھی اپنی طاقت کے استعمال کرنے پر آزاد ہو جاتے ہیں۔ تو یہاں سے اُس معاشرے میں بگاڑ شروع ہو جاتا ہے اور آہستہ آہستہ اُس سماج کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔

افراد میں نفرت عدم مساوات، اور بے سکونی پائی جاتی ہے۔ جس سماج میں امیر کے لیے قانون مختلف اور غریب کے لیے مختلف ہو امیر کو جرم کرنے پر عدالتوں کی طرف سے چھوٹ ملے اور غریبوں کو جرم کرنے پر سزا ہو وہ سماج اور اس کے افراد کبھی ترقی نہیں کر پاتے اور ایک وقت آتا ہے ایسے سماج اپنا وجود کھودیتے ہیں کیونکہ ایسے سماج میں لوگوں کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اداروں کے خلاف نفرت جنم لیتی ہے لوگ ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ بیرونی طاقتیں جو پہلے سے انتشار اور بد نظمی کی منتظر ہوتی ہیں وہ اس بات کا فائدہ اٹھا کر اُس سماج کے افراد کو اپنے مقاصد کے لیے آسانی سے استعمال کرتی ہیں۔ افراد اپنے غلط کاموں سے اُس سماج کی جڑیں کھوکھلی کرتے ہیں جس سے وہ معاشرہ پھر اس ناکارہ جسم کی مانند ہو جاتا ہے جس سے روح رخصت ہو چکی ہوتی ہے اور پھر وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔ اس طرح کے سماج اپنی اہمیت اور اپنا وجود دونوں بہت جلد کھودیتے ہیں اور پوری دنیا کے لیے وہ عبرت بن جاتے ہیں۔ کسی بھی خوش حال معاشرے کا دار و مدار وہاں کے قانون کی مضبوطی اور اُس کی پاسداری ہے۔ بد قسمتی سے پاکستانی سماج میں قانون صرف نام کا ہی رہ گیا ہے اور ہمارے سماج کی صورت حال دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ اس سماج کے زوال کا بڑا سبب یہاں کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔

سماج میں قانون کی حکمرانی نا ہونے کی وجہ سے طبقاتی تقسیم پیدا ہوئی ہے اس سماج کا امیر طبقہ امیر سے امیر تر ہو رہا ہے جبکہ دوسری طرف غریب کی حالت مزید تباہ ہو رہی ہے اور وہ مزید غریب ہو رہا ہے کیونکہ یہاں مال و زر کی تقسیم برابری کے سب اصولوں کو پس پشت ڈال کر لی جاتی ہے۔ جس سے کمزور طبقے کے مسائل بڑھ جاتے ہیں اور طاقت ور طبقہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور اس ظلم کے خلاف بولنے پر طاقت قانونی طریقہ کار اپنا کر اُس کمزور آواز کو دبا دیتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قانون بجائے معاشرے میں عدل و انصاف قائم کرنے کے محض طاقت ور ٹولے کی حفاظت کے لیے بنایا گیا۔ معاشرے کا با اثر اور طاقت ور طبقہ قانون میں جدت کے نام پر اپنے مفادات کے مطابق اپنی مرضی سے تبدیلیاں کرواتا ہے۔ یہ تبدیلیاں اس انداز سے کی جاتی ہیں کہ اُن کے

وہ غلط کام جو اُس سماج کی بقا اور سلامتی اور اس سماج کے افراد کے لیے خطرناک اور نقصان دہ ہوتے ہیں قانون ترمیم کی بدولت خاموشی اختیار کر لیتا جس سے اُن افراد کو غلط کام کرنے کا قانونی سرٹیفکیٹ حاصل ہو جاتا ہے اور آئندہ کے لیے اُن کے لیے اور اُن کی آنے والی نسلوں کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا ہے۔ محترمہ رابعہ رحمن اس فرق کو اپنے ایک کالم میں یوں بیان کرتی ہیں۔

"قوانین تو موجود ہیں مگر اُن قوانین پر عمل درآمد ہوتا بہت کم نظر آتا ہے۔ قانون طاقت ور کے لیے اور جبکہ غریب کے لیے اور بنا دیا گیا ہے جس کی وجہ سے طبقاتی تقسیم بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے۔" (۲۷)

کسی بھی سماج میں قانون کا احترام کرنا لازم ہوتا ہے جو کہ اُس سماج کے حکمران یہ بات طے کرتے ہیں۔ جب ایک حکمران اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتا عام آدمی کی طرح ٹریفک سگنل کا احترام کرتا ہے تو اُس سماج کی عوام بھی دیکھا دیکھی اُس ٹریفک سگنل پر رکتی ہے۔ قانون کا احترام کرتی ہے مگر ہمارے سماج میں بات اس کے الٹ ہے۔ حکمرانوں کی دیکھا دیکھی عوام بھی قانونی تقاضوں کو خاطر میں نہیں لاتی اور قانون کو بھلا کر قانون شکن حرکات میں مشغول ہو جاتی ہے۔ ہمارے صدر یا وزیراعظم یا کوئی اور اعلیٰ حکومتی عہدہ دار ان جس ٹھاٹ سے باہر نکلتے ہیں وہ دنیا کے سامنے ہے جس عوام کے دوٹوں سے یہ لوگ یہ مقام حاصل کرتے ہیں اقتدار میں آکر اُسی عوام سے دوری اختیار کر لیتے ہیں جہاں سے گزرتے ہیں وہاں عام نقل و حرکت پر مکمل پابندی ہوتی ہے اور پولیس جوان زیادہ تعداد میں اُن کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے ہمارے سماج کے سب سے بڑے مسئلے قانون کے دوسرے معیار کو علامتی انداز میں گہرے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ قانون میں امیر اور غریب کے اس فرق کو اپنے ایک کالم "ایک لنگوری کالم" میں بیان کیا ہے۔ تارڑ ایک لنگور کی کہانی بیان کرتے ہیں جو چڑیا گھر سے فرار ہو جاتا ہے۔ وہ انسانوں کی دنیا سے گھوم کر واپس ایک تھانے میں اپنی گرفتاری پیش کر دیتا ہے۔ یقیناً اس کو اپنی دنیا باہر کے انسانوں کی دنیا سے بہتر لگی ہو گی۔ اُس دنیا میں کوئی بھوک سے نہیں مرتا ہو گا اور نا ہی اس کی دنیا میں قتل ہوتا ہو گا۔ انصاف کا ترازو سب کے لیے ایک جیسا تلتا ہو گا۔ چڑیا گھر میں کسی امیر لنگور کو غریب لنگور پر فوقیت نہیں ہو گی اس لیے لنگور اپنی دنیا میں واپس جانے میں ہی عافیت سمجھی۔ لنگور نے انسانی دنیا گھومنے کے بعد اپنی گرفتاری ایک تھانے میں پیش کر دی اور

یہ خبر بھی ہے کہ اُس کو تھانے کی ملحقہ دیوار سے پولیس والوں کی جانب سے پکڑ لیا گیا۔ تھانے والوں کو اس بات کا احساس اُس کو پکڑنے کے بعد ہوا کہ وہ ایک لنگور ہے انسان نہیں ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے ہمارے نظام عدل کی اس خامی کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے کہ جب کسی بھی مجرم کو گرفتار کیا جاتا ہے پھر اس سے سوالات و جوابات کیے جاتے ہیں دوران تفتیش اگر اس بات کا علم ہو جائے کہ گرفتار ہونے والے شخص کا تعلق کس طبقہ سے ہے تو پھر انصاف اور قانون کے تقاضے ہی بدل جاتے ہیں۔ سوالات اور پولیس کا رویہ ایک دم نرم یا مزید سخت ہو جاتا ہے۔

"تھانے والوں کو بہت بعد میں احساس ہوا کہ جو انھوں نے گرفتار کیا وہ کوئی انسان نہیں بلکہ ایک لنگور ہے۔۔۔ گرفتار کرتے ہوئے وہ انصاف کے ترازو کو پکڑتے ہیں اور اُن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوتی ہے اور انہیں کیا پتہ کہ وہ کس کو گرفتار کر رہے ہیں۔" (۲۸)

گرفتار کرنے کے بعد ہمارے سماج میں پولیس کے تفتیشی انداز میں بدلاؤ یقینی بات ہے وہ گرفتار مجرم کے پس منظر تک پہنچتے ہیں اور اگر اس دوران پتہ چل جائے کہ گرفتار شدہ مجرم کسی بااثر شخصیت سے روابط میں ہے تو اُس کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور گرفتار شدہ مجرم کوئی غریب یا عام بندہ ہو تو اس پر تفتیش مزید سخت ہو جاتی ہے۔ پاکستانی سماج میں قانون کا دوہرا معیار عام دیکھنے کو ملتا ہے سانحہ ساہیوال ہو ماڈل ٹاؤن ہو یا اُسامہ سٹی کا واقعہ ہو جہاں قانون کے رکھوالے خود درندگی کا ثبوت دیتے ہیں اگر یہی واقعات کسی بااثر شخص کے ساتھ ہوئے ہوں تو عدالتیں چوبیس گھنٹوں میں امیروں کو انصاف مہیا کرتی۔ مگر یہ عام عوام کے خون کے ساتھ ہاتھ رنگے گئے اور ہمیشہ کی طرح پولیس مقابلہ ناکافی ثبوت کے بہانے بااثر مجرم عدالت سے آزادی کا پروانہ لے کر باہر نکل آتے ہیں۔ قانون اور قانون کے رکھوالوں کے اس انداز تفتیش کو مستنصر حسین تارڑ یوں لکھتے ہیں:

"بس یہ کہ گرفتار شدہ کوئی غرباء ہو تو اگلے روز اُس کے نام، پتے، تصویر اور تفصیل سمیت اخبار میں لگ جاتی ہے اور اگر کوئی صاحب ثروت کا بیٹا ہو تو اسے ایک اہم شخصیت کا بیٹا کہہ کر چپکے سے چھوڑ دیا جاتا ہے۔" (۲۹)

قانون کا یہ دوہرا معیار معاشرے کے افراد میں اور اداروں میں عدم اعتماد کی وجہ بنتا ہے اور جب سماج میں قانون موثر انداز میں کام نہیں کرتا یوں معاشرے میں بد نظمی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ قانون کا تقاضا یہ ہے کہ وہ

معاشرے کے تمام افراد کے لیے یکساں ہو مجرم کو اس کے جرم کے مطابق سزا ملے نہ کہ اُس کی حیثیت کے مطابق اُس کے ساتھ سلوک کیا جائے، غریب اور امیر کے اس فرق کو ختم ہونا چاہیے اور قانون کا احترام اور اس کی بالادستی سب کے لیے ہونی چاہیے۔

## دہشت گردی

دہشت گردی پاکستانی سماج کے لیے ایک ناسور زخم بن چکی ہے۔ چاہے وہ دہشت گردی شریک عناصر اور ملک دشمن لوگوں کی جانب سے ہو یا وہ دہشت گردی جو حکومت اور قانون کے رکھوالے پولیس کی جانب سے ہو دونوں صورتوں میں نقصان ہمیشہ عوام کا ہی ہوتا ہے حکومت کی جانب سے مزاحمت کا بیان سامنے آجاتا ہے اور چند شخصیات محض صحافتی کاروائی کو پورا کرنے کے لیے دوچار باتیں کرتے ہیں۔ اور ہمارے بعض سیاست دان ان واقعات پر بھی اپنی سیاست کی دکانیں چمکانے میں مصروف ہوتے ہیں۔ وہ اتنے بے رحم ہو چکے ہوتے ہیں کہ وہ لوگ جن کے ووٹ کے دم پر وہ اقتدار حاصل کرتے ہیں اور جن کی خدمت کے لیے وہ اقتدار میں آتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں اُن کو اور کیسے اُن لوگوں کی معصوم جانوں کو ضائع کرتے ہیں۔

سیاسی پارٹیوں کی آپس کی چپقلش اور تضاداتی مفادات کی قیمت ہمیشہ عام افراد کو دینی پڑتی ہے۔ اسی بات کو نمایاں کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "ماڈل ٹاؤن دھماکے کی صبح اور پرندے" میں لکھا ہے۔ کہ اچانک دھماکے سے فضا گونج اُٹھی۔ درختوں پر بیٹھے پرندوں نے چیخنا شروع کر دیا۔ دھوئیں کے غبار بلند ہو رہے تھے لوگوں کے چہروں پر بہت خوف تھا۔ ہر کوئی اپنوں کے لیے پریشان تھا۔ لوگ اپنے پیاروں کی خیریت دریافت کر رہے تھے جبکہ منہ میں ایک ہی دعا تھی کہ یا اللہ پاکستان کی خیر ہو۔ وہ لاہور اور وہ ماڈل ٹاؤن پارک جہاں چند منٹ پہلے بہت سکون تھا۔ پرندے آزادی سے اڑ رہے تھے انسان بے فکری سے چل رہے تھے، گھاس پر بڑے شبنم کے قطرے چمک رہے تھے، پھولوں پر شہد کی مکھیاں تھیں اور پانیوں میں مچھلیاں تیر رہی تھیں اور اگلے ہی لمحہ سب کچھ بدل چکا تھا۔ خوف و خطرہ نے امن کی جگہ لے لی تھی۔

واقعے کی نوعیت کوئی بھی ہو اس کے پیچھے چھپے سیاسی مقاصد اور مفادات کچھ بھی ہوں بات یہ ہے کہ اُس دھماکے میں مارے جانے والے افراد عام لوگ تھے۔ بچے اور خواتین زخمی ہوئے جو پیدل چل کر جا رہے تھے۔ ریاست افراد کے لیے ایک ماں کا کردار ادا کرتی ہے۔ معاملات بگڑنے پر اُن کو بات کرنے سے بھی حل کیا جاسکتا

ہے مگر سرعام شہریوں پر گولی برسانے کا حق ریاست کو نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے افراد جو ریاست کی رٹ کو چیلنج کریں اُن افراد سے اُن کے معاملات افہام و تفہیم سے حل کیے جانے چاہیے۔ ہمارے سیاست دانوں کی اور مذہبی رہنماؤں کی بے حسی اور اختیارات کے ناجائز استعمال ملک میں انتشار کو مزید بڑھا دیتا ہے۔ چند لوگ مذمت کا بیان دے کر اپنے فرائض سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں اور اکثریت مکمل خاموش رہتی ہے۔ سیاست دانوں کی اسی بے حسی کو بیان کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ سانحہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"دھماکے کی مذمت کی جارہی ہے صرف مولانا طاہر القادری نے افسوس کا اظہار کیا ہے۔ کسی اور مذہبی رہنما کا بیان نہیں آیا اور شاید آئے گا بھی نہیں۔ مجھ میں یہ جرات نہیں میں اُن کے پُر تقدس لبادے تھام کر فریاد کروں۔ لیکن جو لوگ مارے گئے ہیں بے گناہ ہیں پاکستانی ہیں اور مسلمان ہیں۔ سیاست انسانیت پر غالب آچکی ہے۔ قتل جائز قرار دیا جا چکا ہے۔ میں کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہیں ہوں صرف پاکستان سے اور اس کے لوگوں سے وابستہ ہوں۔ معصوم شہریوں کے قتل عام کے بارے میں کوئی تو ایک حرف ادا کر دیجیے۔" (۳۰)

ریاست کے حکمرانوں پر اپنی عوام کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری ہوتی ہے بگڑے ہوئے افراد کو قانون کے تحت اُن کی تربیت کرنا ریاست کے حکمرانوں کی ذمہ داری ہے ناکہ اپنے اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اُن نہتے لوگوں پر گولیاں برسانا اور اُن کی جانیں لینا۔ یہی غریب عوام اُن کو اقتدار میں لاتی ہے۔ سیاسی تضادات جو بھی ہو اُس کا انتقام عوام سے نہ لیں۔ ۱۱/۹ سے شروع ہونے والی دہشت گردی نے پاکستانی سماج کو بہت نقصان پہنچایا۔ جانی و مالی نقصان کی کوئی حد نہیں۔ دہشت گردی کی اس لہر نے سوات، وزیرستان سمیت پاکستان کے تقریباً تمام شہروں کو ہی متاثر کیا۔ ہزاروں لوگوں نے اپنی جانیں بم دھماکوں میں گنوا دی اور کتنے ہی لوگ معذوری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دہشت گردی میں پڑوسی ملک افغانستان میں ہونے والی جنگ نے اہم کردار ادا کیا۔ پاک فوج نے وزیرستان اور سوات میں ان دہشت گردی کے خلاف کتنی آپریشنز کیے اور کامیابی بھی حاصل کی۔

ملک میں موجود عسکریت پسند تنظیموں اور غیر ریاستی عناصر نے اس کو مزید ہوا دی۔ ہزاروں اس قسم کے واقعات سامنے آئے جو ہماری سیکورٹی اداروں کے لیے سوالات چھوڑ گئے ہیں۔ پشاور کا APS یا سری لنکن

کرکٹ ٹیم پر حملہ یا اسلامک یونیورسٹی کے بم دھماکے سوال یہ ہے کہ دہشت گرد کسے دندناتے ان اداروں میں داخل ہوئے جبکہ عام عوام کو تو داخل ہونے کے لیے اتنے سخت سیکورٹی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور وہاں اسلحہ سمیت دہشت گرد کیسے داخل ہوئے۔ لازماً وہ کسی ناکسی چیک پوسٹ سے بھی ضرور گزرے ہوں گے۔ لاہور میں سری لنکن کرکٹ ٹیم پر حملہ ہمارے سیکورٹی اداروں پر ایک بدنما داغ ہے آخر کیسے دہشت گرد اتنا وقت وہاں فائرنگ کرتے رہے اور سرعام کرتے رہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "دہشت گرد کی سیر" میں اس نقطہ کو نمایاں کیا ہے وہ اداروں کی غفلت پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور ان کی خامیوں کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"سری لنکا کرکٹ ٹیم پر حملہ کرنے والے دہشت گرد لبرٹی گول چکر میں ٹہلتے پھرتے ہیں۔ اطمینان سے فائرنگ کر رہے ہیں اور کھلی فضا میں تقریباً پینتالیس منٹ تک قانونی اداروں کے ساتھ فائرنگ کا تبادلہ ہو ہوتا رہا تھانہ لبرٹی دو قدم کے فاصلہ پر ہے۔ پولیس چوکی فردوس مارکیٹ اور تھانہ نصیر آباد بھی قریب ہے اور ان کھلے عام دہشت گردی کی پلنک منانے والوں کو نہ کوئی پکڑتا ہے نہ حملہ آور ہوتا ہے کیسے پینتیس منٹ میں کیولری گراؤنڈ سے فوج کی پوری پلٹن آسکتی تھی۔ ہیلی کاپٹر سے کمانڈو اتر سکتے تھے اور پورے شہر کی پولیس اور ایلٹ فورس وغیرہ ان کو گھیرے میں لے سکتی تھی تو ایسا کیوں نہ ہوا۔" (۳۱)

آخر ایسی کیا وجوہات ہیں کہ سخت سیکورٹی کے باوجود بھی غیر ملکی لوگ ہمارے ملک میں محفوظ نہیں ہیں۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو پاکستان کی بدنامی کا باعث بن رہے ہیں۔ حال ہی میں نیوزی لینڈ کی کرکٹ ٹیم گراؤنڈ سے میچ سے چند منٹ قبل سیکورٹی کو بنیاد بنا کر اپنا دورہ ادھورا چھوڑ کر وطن واپس روانہ ہو گئی۔ وہ کون سے عناصر ہیں جو پاکستان کو دنیا بھر میں تنہا کر رہے ہیں اور ہمارے ملک کو غیر محفوظ کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔

دنیا میں سب سے زیادہ دہشت گردی کے خلاف پاکستان نے اپنا نقصان اٹھایا، قربانیاں دی، دنیا کو یقین دلاتے رہے کہ پاکستان دہشت گردوں کے خلاف کارروائی کر رہا ہے۔ سیکورٹی اداروں کی غفلت ہو رہی ہے یا اپنوں اور پرانے کی سازشیں جن کی وجہ سے پاکستان کی بدنامی ہوئی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام خامیوں کی نشان دہی کی جائے اور ان پر قابو پایا جائے تاکہ ہمارا سماج ایک محفوظ سماج بن سکے۔

## مغرب پرستی، احساس کمتری:

۷۵ سال آزادی کے گزرنے کے باوجود آج بھی ہم مغرب کے سحر سے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ ہمارا دار و مدار مغربی ممالک پر ہے۔ اندھی تقلید میں ہم اس قدر آگے بڑھ چکے ہیں کہ ہمیں اپنی وہ اشیاء جو باقی دنیا کی نظر میں قیمتی ہوتی ہیں ہمارے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی اور ہماری کوشش بھی یہی ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ امپورٹڈ چیزیں خریدیں اور ہم خریدتے بھی ہیں۔ صفائی کی بات ہو اعلیٰ اخلاقیات کی بات، قانون کی پاسداری کی بات ہو یا کوئی اور معاملہ ہمارے نام نہاد اہل دانش یورپین ممالک کی مثالیں سامنے لے کر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جن اعلیٰ اقدار اور نظم و ضبط کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ یہ ہمارا ہی ورثہ ہے جو ہم نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے گنوا دیا ہے اور ہمارے اسی ورثہ کو اہل مغرب نے اپنایا اور ہم پر چھا گئے ہیں اور ہم دن بدن مزید احساس کمتری کا شکار ہوتے جا رہے ہیں اور اہل مغرب کے مقابلے میں خود کو کم تر سمجھتے ہیں۔

ہمارے سماج کے اس مسئلے کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "بوی بے ایمان ہے" میں طنزیہ انداز اپناتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو بات بات پر مغرب کی اعلیٰ اقدار کی مثالیں دیتے ہیں۔ اُن پر سابق برطانوی پولیس کمشنر کے تحت ایک تنظیم کے چار سال کی تحقیق کے بعد جو نتائج حاصل کیے وہ رپورٹ میں کہا کہ برطانوی پولیس شرابی زانی نسل پرست اور گالی گلوچ کرنے والے لوگوں پر مشتمل ہے ہم لوگ جو بات بات پر مغرب کی مثالیں دیتے ہیں اُن کی حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

"یہ خبر ان افراد پر بجلی بن کر گرے گی جو بات بات پر یورپی اقوام کی ایمانداری اور خوش

اخلاقی کے حوالے دیتے ہیں اور اپنے قومی اداروں اور ملکی اخلاقیات پر برستے ہیں۔" (۳۲)

ہماری اقدار مغرب کے لوگوں سے بہت اعلیٰ اور بہتر ہیں وہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے اکثریت اُن کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔ مغرب کی چکاچوند چیزوں سے ہم زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنی بہترین چیز بھی کم تر دکھائی دیتی ہے۔ اپنی زبان سے لے کر اپنی ثقافت تک ہم ہر روپ میں تبدیلی لاکچے ہیں اور بہت اطمینان سے ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا سامان بنا رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ہمارے رویوں پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہم دراصل جو غریب غربا قسم کے ملکوں کے باشندے ہیں ایک عرصے کی محکومی کے بعد

ابھی تک احساس کمتری کے بوجھ تلے دبے ہیں۔ ادھر ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آتا اور

ادھر سب اچھا ہے ہم میں سے بیشتر متاثرین مغرب ہیں۔" (۳۳)

ہمارے سماج میں اکثر یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگوں کی یہ ہمیشہ سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ مغربی ٹیگ والی اشیا کی ہم خریداری کریں اور لوگ کرتے بھی ہیں۔ بے شک وہ کتنی ہی اپنی چیز کے مقابلے میں غیر معیاری کیوں ناہو اپنی بنی چیزوں کو ہم اہمیت نہیں دیتے۔ بے شک وہ معیاری ہی کیوں نہ ہو اور باقی دنیا میں ان کی مانگ ہو مگر ان چیزوں کو اپنے ہاں فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔

"پاکستانی کپڑے پر غیر ملکی مہر لگی ہو تو واہ واہ سبحان اللہ کیا ڈیزائن ہے کیا میٹرل ہے جس

شے پر بھی پاکستان کے بجائے کسی ایرے غیرے ملک کا نام درج ہو ہم فوراً راقبہ میں

چلے جاتے ہیں اور داد کے ڈونگرے برسانے لگتے ہیں۔" (۳۴)

ہماری بنی مصنوعات کی بے شک دنیا میں مانگ ہو ہمارے ہاں ان کی قدر و قیمت نہیں ہوتی لوگ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ کیا پتہ یہ معیاری ہوگی بھی یا نہیں جبکہ مغربی چیزوں کے معیاری ہونے کا سرٹیفیکیٹ بھی ہمیں ساتھ مہیا نہیں ہوتا۔

"مجھے بھارت سے آئے ہوئے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے اور وہ ہماری بیشتر

مصنوعات کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھتے ہیں اور فرماتے ہیں آپ کے ہاں تو درآمد کرنے

پر پابندی نہیں ہے یہ مال امپورٹڈ ہو گا اور جب انھیں بتایا جاتا ہے کہ یہ کپڑے کی تھان جو

آپ بغل میں داب کر جا رہے ہیں اور یہ آرائش کا سامان اس بے چارے پاکستان میں ہی

بتا ہے تو انہیں بے حد پریشانی ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے لیکن اپنے ہاں کے متاثرین

مغرب کو کیا کہیں جو پھر بھی اپنی مصنوعات کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ دور سے ہی پتہ چلتا ہے کہ پاکستانی ہے۔" (۳۵)

ایک طرف تو ہم مغرب کی اندھا دھند تقلید میں لگے ہوئے ہیں دوسری طرف اپنی تمام تر کوتاہیوں

، خامیوں اور نالائقیوں کو نظر انداز کر کے ہر چیز کا ذمہ دار مغربی سازشوں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ہم اپنے کام میں بے

ایمانی کر رہے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکہ کرتے ہیں، ملاوٹ کرتے ہیں مہنگے دام خرید و فروخت کرتے ہیں،

غریب کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں، لوگوں کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ کیا یہ بھی مغرب کی سازش ہے؟ روزمرہ

زندگی میں نگاہ ڈالیں تو اُن کی بنائی ہوئی تمام اشیاء استعمال کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ہمارے روایتی انداز کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہم اپنی تمام تر ناکامیوں اور حماقتوں کی ذمہ داری ہنود اور یہود کی سازشوں کو ٹھہرا کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔" (۳۶)

اگر مغرب کی سازشوں کا رونا رو یا جاتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اُن کی سازشوں سے بچنے کے لیے ہم کیا کرتے ہیں۔ انھوں نے ہمارے خلاف سازشیں تو کرنی ہی ہیں کیوں کہ بقول ہمارے اہل مغرب مسلمانوں کے دشمن ہیں تو ہم اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے کتنی کوشش کر رہے ہیں اُن کی سازشوں کا مقابلہ کس طرح کریں گے۔ اُن کی کن ایجادات کو ترک کر کے ہم نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں اپنی ایجادات کی۔ ہمارے کون سے تعلیمی ادارے ہماری محنت اور قابلیت کی بنیاد پر دنیا کے بہترین اداروں کی فہرست میں آتے ہیں کون سے ہمارے تعلیمی اداروں نے قابل لوگ عملی زندگی کے لیے تیار کیے۔ کس شعبہ میں ہماری ترقی دنیا کے سامنے ہے اور ایسا ہمارے پاس کیا ہے جو ہمیں اپنی محنت کے بل بوتے پر باقی دنیا سے ممتاز کرے اور ہم ڈٹ کر مغربی سازشوں کا پرچار کر سکیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں کون سا ایسا ادارہ ہے جو مغرب زدہ نہیں ہے ہمارے تمام ہسپتال ان کی مشینری، تعمیری نظام، روزمرہ کی تمام سہولتیں، بجلی، بلب، ٹیلی فون، ڈرائنگ روم میں سچے صوفے کھانے کی میزیں کہاں تک سنو گے، کہاں تک سناؤں، الف سے لے کر یے تک پوری زندگی مغرب زدہ ہے کہ ہم مسلمانوں نے تو پچھلے پانچ سو برس کے دوران ایک نیل کڑا ایجاد نہیں کیا۔" (۳۷)

ہمارے سماج کی تنزلی ہمارے فرائض سے غفلت ہے اور ہمیں یہ عادت ہو چکی ہے کہ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں کا الزام دوسروں پر لگاتے ہیں۔ اہل مغرب سے خوف کھانے کے بجائے اُن کی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر ہم اپنے سماج کو بہتر کریں اور بعد کے لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ ہمارے ہاں مغرب کی روایات کی بہت مثالیں دی جاتی ہیں اگر ہمارے حکمران اُن روایات سے سبق سیکھ لیں قوم کی دولت لوٹ کر باہر کے بنکوں میں نا رکھیں اختیارات کا ناجائز استعمال نہ کریں حقیقی معنوں میں عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کام کریں تو ہمارے پاکستانی

سماج کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

## غربت

غربت پاکستانی سماج کے مسائل میں سے ایک بڑا مسئلہ ہے اس جدید اور ترقی یافتہ دور میں بھی ہمارے سماج کے اکثر افراد کے پاس معقول آمدنی کا کوئی وسیلہ نہیں ہے جس کی وجہ سے اُن کی بنیادی اور جائز ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں اور اُن کا معیار زندگی نہایت کم ہے لوگوں کے پاس جدید سہولیات کا فقدان ہے معاشرے میں موجود دوسرے لوگوں کے برابر وہ زندگی آسانی کے ساتھ گزارنے سے محروم ہیں۔ آمدنی نا ہونے کی وجہ سے وہ پریشانی کے عالم میں اپنا وقت گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایسے معقول آمدنی نارکھنے والے افراد باقی افراد سے مقابلے میں پیچھے رہ جاتے ہیں کیونکہ ایسے افراد اپنے روزمرہ کے حالات اور غربت سے تنگ اور مایوس ہو چکے ہوتے ہیں۔

ہمارے سماج میں اکثر ایک رویہ دیکھنے کو ملتا ہے جو شخص امیر ہے اُس کے ذرائع آمدن وسیع ہیں مالی طور پر اُس کو کسی پریشانی کا سامنا نہیں ہے تو آگے اُس کی اولادیں بھی امیر ہوں گی۔ مثلاً ایک شخص ڈاکٹر ہے تو اُس کا بیٹا اور بیٹی بھی ڈاکٹر ہوں گے اسی طرح وکیل کی اولاد بھی وکیل جاگیر دار کی اولادیں بھی جاگیر دار نظام کے تحت شاہانہ زندگی بسر کریں گی۔ دوسری طرف اگر ہمارے سماج میں کوئی شخص غربت کی زندگی بسر کرتے ہوئے مر گیا یا بسر کر رہا ہے تو لازماً غریب آدمی کی اولاد بھی غریب کی زندگی بسر کریں گے اگر کوئی نائی ہے تو اس کا بیٹا بھی اپنے باپ والا پیشہ اختیار کریں گا۔

غریب کا معیار دن بدن گر رہا ہے اور اُس کی بہتری کے لیے کوئی عملی اقدامات نہیں ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے امیر اور غریب کا فرق پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ کر ہمارے سامنے آرہا ہے۔ اس فرق سے ایک ہی سماج میں رہنے والے افراد میں دوریاں پیدا ہوتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ ہمارے سماج کے اس روایتی نظام اور رویے کو اپنے ایک کالم میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ہمارے ملک میں یہی دستور ہے کہ اگر آپ کے ماں باپ دولت مند ہیں تو آپ بھی

دولت مند ہیں اور اگر غریب ہیں تو آپ بھی غریب ہو جاتے ہیں۔" (۳۸)

امیر اور غریب کا نسل در نسل چلنے والا یہ فرق ہمارے سماج میں عدم مساوات کو جنم دیتا ہے۔ سماج میں

زندگی کے ہر شعبے میں امتیازی سلوک کا نشانہ بن کر یہ لوگ اکثر بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مختلف ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہو جاتے ہیں جس سے سماج کو اور اس میں موجود افراد کو نقصان پہنچتا ہے۔ ہمارے سماج میں غربت کے خاتمے کے لیے ایسے کوئی مضبوط عملی اقدامات نہیں اٹھائے جاتے ہیں جس سے غربت ختم ہو یا اس میں کمی ہو۔ ہمارے سماج میں موجود امیر طبقے بھی غربت زدہ افراد کو بھیک یا خیرات دیتے ہیں مگر وہ اُن کی تعلیم یا اُن کو ہنرمند بنا کر کوئی ناکوئی کام دینے کی طرف نہیں سوچتے ایسے لوگوں کو محض چند روپے ان کی طرف سے دے دیے جاتے ہیں ضرورت اس امر کی ہے کہ سماج میں موجود ایسے افراد کے لیے تربیتی ادارے بنائے جائے جہاں سے وہ کام کی تربیت حاصل کریں اور اُن کو مناسب روزگار فراہم کیا جائے۔ ہمارے سماج کے اسی غلط رویے کی نشان دہی تارڑ صاحب اپنے ایک کالم میں یوں کرتے ہیں:

"ہمارے ہاں رواج ہے کہ غریب لوگوں کو کام نہیں دیا جاتا صرف خیرات دی جاتی ہے۔" (۳۹)

مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ وہ کہیں نا کہیں اپنے ایک ہی کالم میں معاشرے میں موجود دو تین مسائل کا تذکرہ عام سے انداز میں کرتے ہیں جو کہ اُن کی کہانی کو مزید جاندار بنا دیتا ہے لکھتے ہوئے وہ قاری کے سامنے پورا منظر بنا دیتے ہیں۔ اپنے اسی کالم میں وہ ہمارے سماج کے ایک اور مسئلے کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہمارے ڈرائیور حضرات اکثر عوامی سروس میں ایک دوسرے کے ساتھ ریس لگاتے ہیں جس سے نا صرف مسافروں کا جانی نقصان ہوتا ہے بلکہ اکثر پیدل چلنے والے افراد بھی ان کی گاڑیوں کی تیز رفتاری کی زد میں آکر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

"بتایا جاتا ہے کہ آج علی الصبح تین مزداد و گینیں لاہور سے قصور کی جانب جا رہی تھیں، ڈرائیوروں نے آپس میں ریس لگا رکھی تھی جب وہ گجومتہ کے قریب پہنچے تو نامعلوم خاتون اور اُس کے بچے کو روندے ہوئے چلے گئے۔" (۴۰)

ایسے حادثات کے بعد اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ڈرائیور حضرات انسانوں کو کچلنے کے بعد اپنی گاڑیوں سمیت موقع سے فرار ہو جاتے ہیں اور ہماری پولیس کی جانب سے راویتی انداز کو برقرار رکھتے ہوئے ویگن ڈرائیور کے خلاف مقدمہ درج کر دیا جاتا ہے اور یہ حادثات دن بدن کم ہونے کے بجائے زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ ان حادثات پر

قابو پانے کے لیے قانون کی جانب سے کوئی موثر اور مختلف رد عمل سامنے نہیں آتا۔

## گداگری

گداگری ویسے تو پوری دنیا کا مسئلہ ہے لیکن ہمارے پاکستانی سماج میں یہ ایک سنگین صورت حال اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہزاروں گداگر مختلف شاہراؤں میں گاڑیوں کے آگے پیچھے مانگتے نظر آتے ہیں حالانکہ ہمارے فلاحی ادارے بیت المال وغیرہ غریب اور ضرورت مند افراد کی مدد کرنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ ضرورت مندوں سے زیادہ آج کل گداگری ایک آمدنی والا پیشہ بنالیا گیا ہے۔ اس پیشہ کو دیکھا دیکھی بہت سے لوگ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ضرورت مند ہونا ایک الگ بات ہے۔ پر مختلف افراد اس کو صرف اس لیے اختیار کرتے ہیں کہ انھیں کوئی زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی اور آسانی سے پیسے بھی مل جاتے ہیں۔

ایک ایک خاندان کے سات سات لوگ بچوں بوڑھوں سمیت مختلف سڑکوں اور گھر گھر جا کر مانگتے نظر آتے ہیں تو ان افراد میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو معذور ہوتے ہیں اور روزمرہ کے کسی کام میں ہو مشقت نہیں کر سکتے۔ یا ان کے اخراجات پورے کرنے والا کوئی نہیں ہوتا وہ مجبوری میں یہ پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ جہاں اجتماع دیکھتے ہیں وہاں پر پہنچ کر مختلف حیلے بہانوں سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ مدد کرنے والے افراد ان کو اپنی ہمت اور استطاعت کے مطابق پچاس سو روپے دے دیتے ہیں مگر وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر معاشرے کا ایک کار آمد شہری بنانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے ہیں۔ مانگنے والے افراد کا وہ طبقہ جو بغیر کسی معذوری کے اور بغیر کسی ٹھوس وجہ کے مانگتے ہیں یہ لوگ باقاعدہ اپنے بچوں کی تربیت کرتے ہیں کہ کس طریقے سے مانگتا ہے اور اگلے بندے کو دینے پر مجبور کرتا ہے۔ اس مسئلے کے متعلق مستنصر حسین تارڑ "گڈ مارنگ سرعید مبارک" میں لکھتے ہیں:

"ہم عید گاہ کے راستے پر چل رہے تھے اور ہمارے دونوں جانب انواع و اقسام کے گداگر گارڈ آف آنر پیش کر رہے تھے۔ اپنے مڑے تڑے بازوؤں کے ساتھ، بے نور آنکھوں سے اور بھلا ہوا جی، عید مبارخ، تینوں لکھ لکھ مبارخاں، دے جادے جالیکن قابل رحم، میرا مطلب ہے قابل فہم طور پر ابھی ان کی یلغار میں وہ گرمی پیدا نہیں ہوئی تھی جس کے لیے انھوں نے پورا سال تیاری کی تھی۔" (۴۱)

گداگری کے پیشے سے تعلق رکھنے والا ایک وہ گروہ ہوتا ہے جو مصنوعی طور پر معذور بنے ہوتے ہیں۔ اُن میں جسمانی کوئی معذوری نہیں ہوتی اور اس کے باوجود وہ بھی اپنی حرکات اور تربیت کے ذریعے خود کو معذور ثابت کرتے ہیں اور لوگوں کی نظروں میں قابلِ رحم بن جاتے ہیں اور پیسے بٹورتے ہیں ان مصنوعی معذوروں کے متعلق تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

"ایک برقع پوش عورت بار بار اپنے بچوں کے ہاتھ کو اوپر کر کے ٹیڑھا کرنے کی کوشش کر رہی تھی تاکہ یوں لگے جیسے بچہ اپانچ ہے اور بچہ بھی جس کی نظر غباروں پر تھی بھول جاتا اور ہاتھ سیدھا کر دیتا اور مسلسل مار کھاتا چلا جاتا۔" (۴۲)

بعض اوقات ہمارے سماج سے تعلق رکھنے والے وہ افراد جو کہیں پر صفائی کا کام کرتے ہیں یا مالی ہوتے ہیں۔ اُن کی آمدن ان پیشہ ور گداگروں سے بہت کم ہوتی ہے اس فرق کو دیکھ کر بہت سے لوگ محنت سے جی چراکے اس پیشہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔ بعض اوقات ہمارے محافظ اور قانون کے رکھوالے خود ان لوگوں کی پشت پناہی کرتے ہیں اور ان سے اپنا ناجائز حق وصول کرتے ہیں۔

## صفائی کی صورت حال

ہر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ پاکستانی سماج میں صفائی کا مسئلہ تیزی کے ساتھ سر اٹھا رہا ہے۔ اس میں حکومتی اداروں کا قصور تو ہے ہی لیکن ہماری عوام بھی اس کوتاہی کی بھرپور ذمہ دار ہے۔ عوامی جگہوں پر اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ کوڑا دان مہیا ہوتے ہیں لیکن ہماری عوام کی جانب سے اُس کا استعمال نہیں ہوتا۔ کھانے کے بعد فالتو پلاسٹک بیگز باہر پھینک دیے جاتے ہیں یا اکثر پانی والی جگہوں پر پانی کے اوپر تیرتے نظر آتے ہیں جو نا صرف انسانوں کے لیے خطرناک ہے بلکہ آبی مخلوقات کے لیے بھی نقصان دہ ہوتے ہیں لیکن اس پر وہاں کی انتظامیہ کی جانب سے کوئی رد عمل سامنے نہیں آتا جس کی وجہ سے ان افراد کو گندگی کرنے کا سرٹیفیکیٹ مل جاتا ہے اور وہ اپنی حرکات سے باز نہیں آتے۔

ہمارے مذہب اسلام میں صفائی کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے مگر ہمارے سماج کے افراد کے رویوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جیسے باقی تمام شعبوں میں ہم من پسند اسلامی روایت اور تلقین کا پرچار کرتے ہیں اس شعبے میں بھی انہی من پسند روایات کو آگے بڑھاتے ہوئے صفائی کو بس اپنی ذات تک اور اپنے گھر تک محدود کر لیا ہے

اور باقی تمام حصوں کی صفائی کو برقرار رکھنے سے ہم لا تعلق ہو گئے ہیں۔ ہم اپنے گھر میں گندگی برداشت نہیں کر سکتے لیکن اپنے ارد گرد گندگی کے قریب سے ہم منہ ڈھانپ کر نکل جاتے ہیں اور جہاں ہمارا من کرتا ہے گندگی کرتے ہیں۔ ہماری اس لا پرواہی اور کوتاہی کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "آدھے مسلمانوں کا ملک" میں یوں لکھتے ہیں:

"ہمارے ماحول، آب و ہوا اور صفائی نصف ایمان کا حصہ ہے لیکن ہماری صفائی ہماری ذات سے شروع ہو کر اپنی ہی ذات پر ختم ہو جاتی ہے اور اس سے باہر ہم سڑکوں، بازاروں، گلی محلوں میں گند ڈالنا اپنا فرض منصبی سمجھتے ہیں اور اس میں ہمیں کمال حاصل ہے۔" (۴۳)

ہر معاملے کی طرح صفائی کے معاملے میں بھی ہمارے قانون کی دھجیاں اڑائی جاتی ہیں لیکن کوئی کسی کو پوچھتا نہیں ہے۔ بے لگامی کی صورت حال بن چکی ہے یہاں جس کا جو من کرتا وہ کرتا ہے مگر حساب نہیں لیا جاتا۔ جب ہمارے سماج کے افراد ملک سے باہر چلے جائے تو وہاں قانون کے مطابق اُن کو ہر چیز کا پابند ہونا پڑتا ہے۔ ہر ایک غلط عمل کا حساب دینا ہوتا ہے اس لیے وہ سدھر جاتے ہیں۔ اپنے سماج میں غیر تہذیب یافتہ افراد جب قانون کی بالادستی کو برقرار رکھنے والے ملک میں جاتے ہیں تو اپنے طور طریقے بدل دیتے ہیں۔ وہی لوگ جب وطن واپس آتے ہیں تو یہاں کے ماحول کے مطابق دوبارہ لا قانونیت کی جانب آ جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اس صورت حال کو ایک واقعے کے ذریعے بیان کیا ہے۔ میرے ایک دوست نے سگریٹ کی راکھ پھینکنے کے لیے ایش ٹرے کی طلب کی تو میں نے اُسے کہا فرش پر پھینک دو اور پھر کیلے کھانے کے بعد میرا دوست ان چھلکوں کو بیگ میں رکھتا گیا اور میں بازار میں اچھالتا گیا اُس نے مجھ سے کہا مجھے امید نہیں تھی تم جیسا آدمی بھی معاشرتی عقل سے کوراہو گا مزید کہنے لگا کہ ہمارا فرض ہے ہم جس ماحول میں رہتے ہیں اُس کو صاف رکھیں۔ میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا اور میں یہ ڈسٹ بن میں پھینکوں گا اور اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور چلا گیا۔ پچھلے ہفتے وہ بیرون ملک سے واپسی پر ملنے آیا لیکن اس مرتبہ اس نے ایش ٹرے نہیں مانگی۔ معمول کے مطابق میں نے اُس کو فروٹ پیش کیا مگر اس بار اُس نے محب الوطن پاکستانیوں کی طرح ان کے چھلکے بالکل صاف ضمیر کے ساتھ بازار میں پھینک دیے تو میں نے سوال کیا میاں تم تو معاشرتی عقل سے چھلکتے پڑتے تھے اب کیوں چھلکے پھینک رہے ہو تو اُس نے کہا کہ اُس روز جب میں نے چھلکے بیگ میں ڈالے تھے تب مجھے کہیں ڈس بن دکھائی د نہ دیا

میں نے شروع شروع میں خود کو صفائی کے عذاب میں مبتلا رکھا مگر دوستوں اور رشتہ داروں نے مذاق اڑایا لیکن میں اب پاکستانی بن گیا ہوں۔ بیرون ملک جا کر صفائی پسند ہو جاؤں گا۔

اس واقعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ کسی بھی معاشرے میں توازن کو برقرار رکھنے کے لیے اور برائیوں کو ختم کرنے کے لیے قانون کی بالادستی کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمارے پاکستانی سماج میں صفائی نہ رکھنے والوں کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی ٹیکس رکھا جائے یا اس کے لیے قانون میں جرمانہ ہو اور وہ قانون نافذ ہو تو یقیناً پاکستانی سماج میں صفائی کی صورت حال بہت بہتر ہو جائے گی۔

## غیر امتیازی اور غیر انسانی سلوک

پاکستانی سماج میں بھی تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ بہتر سلوک نہیں کیا جاتا ہے جس طرح کوئی بھی انسان اپنی پسند سے لڑکا یا لڑکی پیدا نہیں ہوتا بالکل اسی طرح تیسری جنس / صنف سے تعلق رکھنے والے افراد بھی اپنی مرضی سے اس صنف کی صورت میں پیدا نہیں ہوتے۔ ہمارے سماج میں چونکہ اسلام مذہب رائج ہے اور زیادہ تر مسلمان اس سماج میں رہتے ہیں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اس صنف سے تعلق رکھنے والے افراد کی حوصلہ افزائی کی جاتی، اُن کو ان کی گھر کی دہلیز پر مکمل حقوق دیے جاتے۔ پر صورت حال کچھ اس طرح کی ہے کہ اُن کے پیدا ہونے کو ایک گالی جانا جاتا ہے۔ پہلے تو اس بات کو چھپایا جاتا ہے پھر جب یہ بڑے ہوتے ہیں ان کو گھروں سے نکال دیا جاتا ہے یا کم سنی میں ہی نکال دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے گھر سے نکلنے کے بعد سماج کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں اور وہ سماج جو پہلے ہی ان کے وجود سے انکاری ہو وہ اُن کو کیا تحفظ فراہم کرے گا۔ گھروں سے نکل کر اپنے بنیادی حقوق سے محرومی پر یا تو وہ بھیک مانگتے ہیں یا وہ رقص کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں یا پھر انھیں جسم فروشی پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہمارے سماج کے امتیازی رویے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ابھی کچھ عرصہ پیشتر ٹیکسلا میں کسی شادی کے تقریب میں حسب روایت کچھ ہجڑے اپنے انداز میں تالیاں بجاتے رقص کرتے اہل خانہ کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ جب مقامی پولیس نے دھاوا بول دیا۔ اُن کا میوزک سسٹم توڑ دیا اور متعدد ہجڑوں کو نہ صرف زد و کوب کیا بلکہ ان میں سے کچھ کو گرفتار بھی کر لیا کیونکہ وہ غیر قانونی سرگرمیوں میں مشغول تھے اور اس ظلم کے خلاف اسلام آباد میں ایک اعلیٰ افسر کے دفتر کے سامنے

احتجاج کیا اور پھولوں کے چند گملے توڑے۔" (۴۴)

ہجڑوں نے اپنے غصہ کا اظہار گملے توڑ کر کیا نہ کہ عام انسانوں کو ذبح کیا اور نہ ہی کہیں خود کش دھماکے کیے ناہی ملکی املاک کو نقصان پہنچایا اور ناہی غریب عوام کی گاڑیوں کو آگ لگائی۔ آخر یہ ہجڑے کریں بھی تو کیا کریں یہ جائیں تو کہاں جائیں۔

"آخر یہ ہجڑے روزگار کے لیے کیا کریں انھیں سکول، کالجوں میں داخلہ ملتا نہیں اگر پڑھ لکھ جائے تو سرکاری نوکری ملتی نہیں۔ بسوں ٹرکوں اور ویگنوں میں انھیں بیٹھنے نہیں دیا جاتا۔ ماں باپ گھروں سے نکال دیتے ہیں۔ بہن بھائی اُن کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ جہاں جاتے بس ذلت اور تضحیک کا نشانہ بنتے ہیں۔" (۴۵)

بدلتے وقت کے ساتھ حکومت نے تیسری صنف سے تعلق رکھنے والے افراد کی سماج میں صورت حال کو بہتر کرنے کی کوشش کی، اُن پر تعلیم کے دروازے کھولے گئے۔ سرکاری نوکریوں میں اُن کے لیے کچھ کوٹہ مختص کیا اور عدالت کی طرف سے بھی اُن کو انصاف کی فراہمی کی یقین دہانی کروائی گئی۔ مگر یہ اقدامات ابھی بھی ناکافی ہیں۔ ان کی تعداد میں روزانہ اضافہ ہو رہا ہے اور ان کا معیار زندگی تیزی سے بہتر ہوتا دکھائی نہیں دے رہا سماج میں اب بھی ان افراد کو امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان سے بھیک منگوانا یا رقص کروانے تک محدود کیا جاتا ہے۔

## مذہب

پاکستانی سماج کے اندر ہونے والی دہشت گردی کی کاروائیوں میں ملوث پاکستانی تنظیموں نے مذہب کی ساکھ کو کافی حد تک بدنام کیا ہے۔ افغانستان جنگ کے دوران سر اٹھانے والی ان جہادی تنظیموں نے پاکستان کے اندر نا صرف غیر ملکی اداروں کو نشانہ بنانا شروع کیا بلکہ اپنے سماج کے اندر فرقہ واریت پھیلانے کے لیے منفی سرگرمیاں شروع کر دی۔ ان سرگرمیوں کے پیچھے ملکی ہاتھ ہو یا غیر ملکی عناصر پاکستانی سماج کا غلط تاثر دنیا کے سامنے جاتا ہے اور اسلام مخالف لوگوں کو مواقع فراہم کیے جاتے ہیں کہ وہ اسلام اور مسلمان کو تنقید کا نشانہ بنائیں اور دہشت گردی کو مذہب سے جوڑیں۔ اس تخریب کاری میں ملوث جو ملکی و غیر ملکی عناصر کی منفی سرگرمیوں کی وجہ سے ہزاروں عام شہری اپنی قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ افغانستان جنگ سے شروع ہونے والی دہشت

گردی نے جانی و مالی سطح پر ہمارے سماج کو بہت نقصان دیا۔ ان تخریب کاروں نے فرقہ واریت کو ہمارے سماج میں فروغ دینے کے لیے مختلف فرقوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور ان کے مذہبی مقامات کو نشانہ بنایا۔

مسجدوں، امام بارگاہوں میں اپنی عبادات میں معصوم اور بے گناہ لوگوں کو شہید کرنے کے بدلے میں ان کو جنت کا سرٹیفکیٹ عطا کیا جانے لگا۔ دھماکے کے بعد کسی ناکسی جہادی تنظیم کی طرف سے اُس حملہ کی ذمہ داری قبول کی جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ان جہادی تنظیموں کی کاروائیوں پر سخت تنقید کرتے ہیں۔ اُن کی ان فرقہ وارانہ کاروائیوں کی وجہ سے اسلام بدنام ہو رہا ہے اور غریب بے گناہ شہری اپنی زندگی ہار دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم "پاکستان کا قومی جانور بھینس، گدھایا اونٹ" میں اس گھمبیر مسئلہ پر تنقید کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

"بری امام اور کراچی میں جو معصوم لوگ قتل کر دیے گئے ہیں بلکہ جن کے پرچے اڑا دیے گئے ہیں تاکہ اُن کی تدفین میں بھی مشکلات پیش آئیں اور جنہوں نے اُن کے ٹکڑے کیے وہ بھی اپنے تئیں سیدھے جنت الفردوس میں چلے گئے۔" (۴۶)

پاکستان بھر میں ہونے والی ان دہشت گردوں کی کاروائیوں میں معصوم لوگوں کے جسموں کے ٹکڑوں کو سمیٹ کر اُن کو قبروں میں ڈالا گیا پشاور کا خیبر بازار جہاں بم دھماکے سے مرنے والے عام لوگوں کی کسی سے کیا دشمنی ہو سکتی تھی یا اُن کا سیاست سے کیا لینا دینا تھا۔ ان دہشت گردوں کے مقاصد جو بھی ہوں اُس کی قیمت معصوم لوگ اپنی جانوں کو گنوا کر کے ادا کرتے ہیں۔ خیبر بازار کے واقعے کی طرح درجنوں اور واقعات ہیں جن میں مرنے والے عام مزدور تھے جو رزق حلال کمانے کے دوران ان کا نشانہ بنے۔ مستنصر حسین تارڑ کراچی میں K.F.C کی عمارت میں ہونے والے بم دھماکے میں گنوائی جانے والی جانوں پر تذکرہ کرتے ہوئے اُس سوچ پر تنقید کرتے ہیں جس سوچ نے ہزاروں لوگوں کو نگل لیا۔

"کراچی میں پاکستانیوں کے پیسے سے تعمیر کردہ امریکی نام ریستوران ہے اس میں جلا دیے جانے والے خاکروب اور ویٹرز کی لاشوں پر دھیان نہ دے کر انھیں جلا دینے والے بھی اپنی مقامی سیاست کا غصہ امریکہ پر اتار رہے تھے اور اُن پاکستانی کفار کو قتل کر کے اسلام کا نام بلند کر رہے تھے اور اُن کی چھ جلی ہوئی لاشوں کا سوگ منانے کی ضرورت نہیں کہ آخر وہ کیوں ایک امریکی نام کے ریستوران میں حلال کما کر اپنے بال بچوں کو پال رہے تھے۔" (۴۷)

اسلام مذہب امن کی تلقین کرتا ہے کسی غیر مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد کو قتل سے منع کیا گیا۔ ایک انسان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے برابر قرار دیا گیا۔ چند عناصر اپنے مقصد کے لیے عام اور سادہ لوح انسانوں کو مذہب کی غلط تشریحات کر کے جذباتی طور پر ابھارتے ہیں اور ان سے سماج دشمن حرکات کرواتے ہیں۔ اگر ان چند افراد کو حکومت سے کوئی بھی شکایت ہو تو وہ ٹیبل ٹاک کے ذریعے اپنے مسائل حل کرے ناکہ غیر ملکی اور ملکی لوگوں کی بے گناہ جان لے کر سماج میں مزید بد امنی نہ پھیلائے۔ مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب کی یہ خوبی ہے کہ کسی بھی مسئلے کو اجاگر کرنے کے لیے وہ علامتی انداز اپناتے ہیں اور اسی انداز کے ذریعے وہ معاشرے میں موجود کسی ناکسی اہم مسئلے کو اجاگر کرتے ہیں ہمارے سماج میں فرقہ واریت کا مسئلہ تیزی سے اٹھ رہا ہے اور پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے عقیدہ ایک ہونے کی صورت میں مختلف طریقہ کار پر لڑائیاں عام ہیں اور عام لوگوں کی زندگیوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ انسانوں اور جانوروں کے اس فرق کو علامتی انداز میں بیان کیا۔

"چنانچہ میں نے اپنی صحت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان تمام حقائق سے آنکھیں چرا کر بھینسوں، گدھوں، اونٹوں اور بھیڑوں کے بارے میں کالم لکھنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ یہ جانور ایک دوسرے کو عقیدے کی بنیاد پر قتل کر کے جنت نہیں کماتے۔ آپ نے کبھی سنا ہو گا کہ کسی گدھے نے کسی اور گدھے کو محض اس لیے ہلاک کر دیا ہو کہ اس کے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے کا انداز اس سے مختلف ہے یا کوئی اونٹ اپنے بدن کے ساتھ بارود باندھ کر اونٹوں کے کسے گلے میں جا گھسا ہو اور اپنے سمیت درجنوں اونٹوں کو محض اس لیے قتل کر رہا ہو ان کی چال اُسے پسند نہ ہو۔" (۴۸)

انسان اور جانور میں فرق عقل و شعور اور سوچ سمجھ کا ہے انسان اشرف المخلوقات ہو کر بھی درندوں جیسا کام کر کے معاشرے کا سکون برباد کر رہے ہیں جبکہ جانوروں میں ایسا کچھ نہیں وہ امن و سکون سے زندگی بسر کر رہے ہیں:

"یعنی یہ جانور ابھی تک حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں اور انھیں کچھ شعور نہیں کہ انسانی سطح پر زندگی بسر کرنا کیسا ہوتا ہے۔ اگر وہ بھی ہماری طرح تہذیب یافتہ ہوتے عقیدے میں پختہ ہوتے تو یقیناً ایک دوسرے کو قتل کر کے ثواب کماتے۔" (۴۹)

آج کا انسان اتنا بے حس ہو چکا ہے کہ وہ درندوں جیسی حرکتیں کرنے پر اتر آیا ہے۔ انسان انسان کے لیے خطرہ کی علامت بنتا جا رہا ہے سماج میں بے سکونی اور انتشار کو پھیلایا جا رہا ہے۔ ہمارے مذہب کی خوب صورت تعلیمات کی غلط تشریحات کروا کہ اُن کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے آپس میں تفرقہ ڈالا جا رہا ہے حالانکہ ہمارے مذہب میں فرقہ بندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مسلمانوں کے لیے واضح حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور آپس میں تفریق نہ پیدا کرو۔

### مذہبی انتہا پسندی

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح طور پر بیان کی ہے کہ یہود و نصاریٰ اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ ان کی سازشوں اور چالوں سے بچنے کے لیے مسلمانوں کو خبردار کر دیا گیا تھا مگر آج کا مسلمان اپنے دین کی تمام سنہری تعلیمات کو بھلا کر یہود و نصاریٰ کے تابع آچکا ہے۔ نا انصافی، سستی و کاہلی، عیش و عشرت اور لالچ کے سبب ہم اپنا وجود کھوتے جا رہے ہیں۔ ہمارے لوگوں کو اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف جس طرح مرضی استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارے اپنے ہی چند عناصر جو مذہب کو کاروبار کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔ گناہ اور ثواب کی اصل روح کو بری طرح مسخ کر دیا گیا ہے۔ فرقہ واریت کے سبب ایسے بہت سے واقعات کے ذریعے ہم دنیا کو باور کروا رہے ہیں کہ ہمارا معاشرہ تضاداتی عقائد رکھنے والوں کے لیے بالکل محفوظ نہیں ہے۔

ہم ہر معاملہ میں اپنی رائے دوسروں پر تھوپنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اپنی رائے کے مقابلے میں دوسروں کے رائے کو ہم غلط قرار دیتے ہیں ہر صورت میں ہمیں اپنی رائے درست منوانے کی عادت ہو چکی ہے۔ ایسے میں اختلاف رائے رکھنے والوں کے لیے ہم موت کی صورت میں بھی سزا دینے سے باز نہیں آتے ہیں۔ بے شک اختلاف رائے درست کیوں نا ہو نا صرف ہمارے پاکستانی سماج میں بلکہ دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے مسائل دن بدن بڑھ رہے ہیں۔

دنیا کے ہر سماج کی طرح پاکستانی سماج میں بھی قانون موجود ہے اور مذہبی توہین کے واقعات کی روک تھام کے لیے قانون میں سزا بھی موجود ہے مگر گزشتہ کچھ وقت میں ہمارے سماج میں ایسے کہیں واقعات رونما ہو چکے ہیں جو ہماری عوام کی مذہبی انتہا پسندی کو ظاہر کر رہے ہیں اگر کسی بھی مسلم یا غیر مسلم کی طرف سے ایسی کوئی حرکت سامنے آجائے جو ہمارے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچائے ہماری عوام قانون کو بھلا کر خود ہی کاروائی کرنے

میں مصروف ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ مردان کی ایک یونیورسٹی میں پیش آیا جس میں وہاں کے ایک طالب علم پر توہین مذہب کا الزام لگا کر وہاں کے مشتمل ہجوم نے سخت تشدد کا نشانہ بنا کر اُس کو ابدی نیند سلا دیا بعد میں قانونی کارروائی کے نتیجے میں یہ بات معلوم ہوئی کہ اُس طالب علم نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی تھی وہ اُس مذہب کے نام پر بے گناہ قربان ہوا جس مذہب میں انسان کی جان و مال کو ایک دوسرے پر حرام قرار دیا۔ بالفرض ایک یہ بات سچ ثابت ہو بھی جاتی تو کیا لوگوں کی طرف سے ہونے والی یہ کارروائی اس طالب علم کی جان لینا کہاں ثواب کا کام تھا۔ ان واقعات میں عام عوام کے علاوہ پنجاب کے سابق گورنر کو بھی گولی مار کر اُن کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مذہبی انتہا پسندی پر اپنے ایک کالم میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"اسلام آباد کی ایک بچوں کی لائبریری پر ابھی تک طالبات کا قبضہ ہے جنہوں نے پچھلے دنوں دھمکی دی تھی کہ وہ فدائی حملہ کریں گی۔ یا اللہ! یہ کس پر حملہ کریں گی؟ اپنے ملک پر یہاں کے شہریوں پر کس پر حملہ کریں گی؟ ابھی ایک برس ہوا ہے کہ مذہب کے نام پر میرے شہر لاہور کو جلادیا گیا تھا غریبوں کی سینکڑوں سائیکلیں اور موٹر سائیکل جلا دیے تھے۔ پنجاب بینک اسمبلی اور تاریخی شیزان ریسٹوران کو آگ لگا دی تھی۔" (۵۰)

جذباتی عوام اپنے ہی شہروں اور املاک کو نقصان پہنچاتی ہے جس سے بہت سے غریبوں کا نقصان بھی ہوتا ہے اور انسانی جانوں کا ضائع ہونا بھی ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ سماج میں کوئی شخص بھی اٹھ کر ایسے ظلم سے اسلام کی تبلیغ کرنا جو کہ صحیح طریقہ کار نہیں اور نا ہی زبردستی کی اجازت ہے۔

"ایک نوجوان وزیر ظل ہما کو اُس کی کنپٹی پر گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا ہے اور باریش قاتل کہتا ہے کہ وہ ملک میں بے حیائی اور فحاشی کا خاتمہ کر رہا ہے اور اسلام کی سر بلندی کے لیے کام کر رہا ہے اس وزیر کا لباس اسلامی نہیں تھا یہ سوچ کہاں سے آئی، اس سے پیشتر وہ نصف درجن سے زائد بقول اس کے برے کردار کی حامل عورتوں کو ہلاک کر چکا ہے لیکن ہمیشہ بری ہو جاتا ہے یہی معاشرہ اس کو بری کرتا ہے کہ اس کے نزدیک ایسی عورتوں کو قتل کرنا کوئی ایسا بڑا گناہ نہیں ہے کہ ایک پرہیزگار مسلمان کو چھانسی پر چڑھایا جائے۔" (۵۱)

اسلام امن کا مذہب ہے اس میں زبردستی کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے اگر کوئی اس طرح کی کاروائیوں

میں ملوث ہے جس سے ہمارے مذہبی جذبات مجروح ہونے کا ڈر ہو تو قانون کے مطابق اس مسئلہ کا حل نکالا جائے نا کہ مشتعل ہو کر اپنا اور دوسروں کا نقصان کیا جائے۔ ہمارے سماج میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلم بھی رہتے ہیں ناصرف مسلمانوں کے لیے بلکہ غیر مسلموں کے لیے ہمارا سماج دن بدن غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے اور اس کو غیر محفوظ کرنے میں ہمارا اپنا بھی حصہ برابر کا ہے۔

اقلیتوں کی طرف سے اگر گستاخی کا کوئی واقعہ سامنے آجائے تو قانون تک پہنچنے سے پہلے ہی مشتعل عوام اُن کو جلا کر دنیا کو یہ پیغام دیتی ہے کہ ہمارا سماج اب محفوظ نہیں ہے۔ خوف و ہراس پھیلا یا جاتا ہے۔ دنیا ہمیں دہشت گرد اور مذہبی جنونی کے نام دیتی ہے اور ایک دفعہ پھر اہل مغرب اور اسلام دشمن عناصر کو اسلام اور مسلمان پر وار کا موقع مل جاتا ہے، اور پاکستانی سماج کو اقلیتوں کے لیے غیر محفوظ قرار دیا جاتا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات ہمارے سماج میں وقوع پذیر ہوئے ہیں کہ قانون کے ایکشن سے پہلے عوام نے جنونیت کا ثبوت دیتے ہوئے زندہ جلایا۔ ایسا ہی ایک واقعہ سیالکوٹ میں چند ماہ پہلے پیش آیا جہاں ایک کارخانہ میں کام کرنے والا ایک غیر مسلم مینجر کو گستاخی کے معاملے میں ہجوم نے بازار کے بیچ میں آگ لگا کر زندہ جلایا۔ قانون کو سچ یا جھوٹ ثابت کرنے کی نوبت ہی نہ آنے دی۔ قانون میں مذہبی جذبات مجروح کرنے کی سزا موجود ہے۔ اس قسم کے واقعات قانون کے ذریعے حل کیا جائے نا کہ عوام ان واقعات پر مشتعل ہو کر دنیا کو اپنی درندگی کا ثبوت نہ دے اور اسلام کی بدنامی کا باعث نہ بنے۔ اسی ضمن میں مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم میں اقلیتوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات پر لکھتے ہیں:

"ایک عیسائی پر اس کے ساتھ روزانہ جوا کھیلنے والے مسلمان نے کچھ رقم ہارنے کے بعد الزام لگا دیا کہ اس نے جلتی ہوئی دیا سلائی ہماری مقدس کتابوں پر پھینکی تھی قطع نظر اس پر الزام لگانے والا کتنا دین دار شخص تھا کہ روزانہ جوا کھیلتا تھا۔ اس الزام کی تفتیش ہونی چاہیے اور اگر یہ ثابت ہو جائے تو قانون کے مطابق جیسا بھی قانون ہے اُسے سزا ملنی چاہیے۔" (۵۲)

مذہبی انتہا پسندی سماج میں خوف و ہراس پھیلاتی ہے۔ ملک دشمن عناصر اور سماج دشمن عناصر اس کی آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے کام کرتے ہیں اور سماج کو غیر محفوظ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قانون

کی عمل داری کو ہر صورت یقینی بنایا جاتا ہے اور ان واقعات کی روک تھام کے لیے لوگوں میں شعور پیدا کیا جائے۔

## سماجی اقدار

سماجی یا اخلاقی اقدار کسی بھی سماج کی مضبوطی اور خوشحالی میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ انھیں اقدار کے ذریعے اچھائی یا برائی کا تعین ہوتا ہے اور انھی کی روشنی میں افراد کے اچھے اور برے رویوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ قرۃ العین اعظم اپنے مقالے میں اخلاقی اقدار کی تعریف لکھتی ہیں: ”اخلاقی اقدار سے مراد اچھے و برے کی تمیز کرنا نیکی و بدی کی پہچان وغیرہ۔“ (۵۳) جب انسان شعور حاصل کرتا ہے تب اس کے اندر سوچنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ وہ نیکی کے راستے کی طرف جاتا ہے۔ یا ایسے کام کرتا ہے جس سے سماج کو نقصان نہیں ہوتا یا پھر وہ ایسے برے کام کرتا ہے جس سے سماج میں بد نظمی اور بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاقی اقدار انسان میں اچھے اور برے کی تمیز پیدا کرتی ہیں اور صحیح اور غلط میں فرق واضح کرتی ہیں۔ جو سماج اپنی اخلاقی اور سماجی روایات کو توڑتے ہیں وہ سماج تباہی اور بربادی کا شکار ہو کر تمام دنیا کے لیے عبرت بن جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ اپنا وجود کھودیتے ہیں۔ پاکستانی سماج میں رائج سماجی اقدار افراد کے برے رویوں سے کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔ بددیانتی، بدحالی، چوری، ریاکاری، بے ایمانی، نا اتفاقی، خود غرضی، مکاری وغیرہ عام ہیں جس کی وجہ سے سماج میں بد امنی اور بے سکونی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

## عدم برداشت

ہمارے سماج میں ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ صبر و تحمل ختم ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایک دوسرے سے معمولی باتوں کو جھگڑوں میں تبدیل کر دیا جاتا ہے اور یہ جھگڑے بعض اوقات جانی و مالی نقصان کا موجب بنتے ہیں۔ معاشرے میں افراد تفری اور انتشار کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ انتشار ایک بندہ سے پورا گروہ تک پھیل جاتا ہے جس سے سارا معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم ”روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے“ میں ہماری ایک سماجی اقدار کی پامالی کی طرف نشان دہی کی ہے۔ ہمارے سماج میں اکثر ایک جملہ سننے کو ملتا ہے کہ روزوں میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ رمضان المبارک مسلمانوں کے لیے ایک مقدس مہینہ ہے۔ جس کا احترام کرنا ہم پر فرض ہے۔ یہ مہینہ صبر کی تلقین کرتا ہے اور اپنے اندر برداشت پیدا کرنے کا درس دیتا ہے مگر ہمارا سماج اس مہینے

میں عدم برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تمام برائیاں اسی مہینے میں بھی موجود رہتی ہیں۔ رمضان میں اکثر لڑائی جھگڑے دیکھے جاتے ہیں۔ معمولی باتوں پر قتل جیسے واقعات سامنے آتے ہیں۔ بازار میں چلے جاؤ تو دوکاندار اشیاء کی قیمتیں باقی دنوں سے زیادہ بتاتے ہیں پوچھو تو کہا جاتا ہے (روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے) کہیں کسی سے ذرا سی بات پر بحث ہو جائے تو جواب ملتا ہے روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

"ان دنوں ہر دوسرے فقرے کے بعد جو فقرہ سننے میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے یہ فقرہ ایک ناقابل تردید جواز ہے جسے پیش کر کے آپ نہ صرف ہم فعل سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں بلکہ مخالف کو بھی شرمندہ کر دیتے ہیں۔" (۵۴)

رمضان میں عدم برداشت کے واقعات عام ہو چکے ہیں۔ معمولی باتوں پر مرنے مارنے پر آجانے والے لوگ بھی روزہ دار ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ روزہ لگ رہا ہے حالانکہ رمضان کے حوالے سے ایسا کوئی حکم ہمیں اسلام نے نہیں دیا کہ لڑنا جھگڑنا ہے یا عدم برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رمضان کے ساتھ ساتھ باقی تمام مہینوں میں بھی صبر کی تلقین کی گئی ہے مگر ہم اپنی غلط حرکتوں پر قابو نہیں رکھتے اور وجہ روزوں کو ٹھہراتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ طنز و مزاح کے ساتھ واقعاتی انداز میں رمضان میں ہونے والے واقعات کے ذریعے ہمارے اس سماج کے افراد کی خامیوں کو بیان کرتے ہیں۔

"بنک میں ایک خاتون نے دو چار سو روپے کا چیک کیش کروایا اور گارڈ سے کہنے لگی میرے ساتھ کار تک چلو ان دنوں ڈاکے بہت پڑ رہے ہیں۔ گارڈ نے کہا بی بی میں بنک نہیں چھوڑ سکتا اور یہ میری ذمہ داری نہیں ہے۔ آپ فکر نہ کریں اتنی چھوٹی رقم کوئی نہیں لوٹے گا وہ خاتون مینجر صاحب پر برس پڑی کہ آپ کا عملہ بد تمیز ہے۔ اُن کے رخصت ہونے پر میں نے مینجر صاحب سے افراتفری کی وجہ پوچھی تو گھور کر کہا روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" (۵۵)

ایک اور واقعے میں لکھتے ہیں:

"ایک سپر سٹور میں بڑی مشکل سے ایک ٹرائی حاصل کر کے لایا ہوں اور شیلف پر سے کچھ پنیر اور جیم وغیرہ اٹھا کر پیچھے ہوئی تو ٹرائی غائب میں نے کسی سے شکایت نہ کی کہ روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" (۵۶)

سیر کرتے ہوئے ایک صاحب سے کہتا ہوں۔ ”لیجیے جناب زرداری صاحب صدر ہو گئے تو وہ کہتا ہے روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔“<sup>۵۵</sup> ایسے بہت سے ہمارے سماج کے عدم برداشت کے رویے کے حوالے ملتے ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں رمضان کے حوالے سے جو احترام تھا وہ آہستہ آہستہ تبدیلی کی نظر ہو رہا اور دوسرا ہماری سماجی اقدار کی دن بدن ضروری کو ظاہر کرتے ہیں۔

## نا اتفاقی

نا اتفاقی ناصر ف پاکستانی سماج کا مسئلہ بلکہ یہ پوری امت کا مسئلہ ہے وہ امت جس کو ہمیشہ متحد ہونے کی تلقین کی گئی تھی۔ وہ امت جس کو ایک جسم کی مانند قرار دیا گیا تھا کہ جسم کے ایک حصہ کو تکلیف ہو تو درد سارے جسم کو محسوس ہوتا ہے۔ اُس امت نے خود اپنے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں اُن کو اب ایک دوسرے کے دکھ درد محسوس ہی نہیں ہوتے یا اگر ہوتے بھی تو بیرونی دباؤ کے تحت کچھ بولا نہیں جاتا اپنے مفادات زیادہ عزیز ہو گئے ہیں مختلف فرقوں نے ہمارے سماج کے اندر جنم لے لیا ہے۔ ہر ایک کے اپنے طور طریقے ایجاد ہو گئے ہیں ہر ایک کی سوچ کے مطابق وہ درست ہے اور دوسرا غلط ہے۔ ہر ایک فرقے نے اپنے اپنے طریقے ایجاد کر لیے ہیں۔ اپنی اصل سے مکمل طور پر ہٹے جا رہے ہیں۔ پاکستانی سماج کی جب بنیاد رکھی گئی تب بھی قوم کو نصیحت کی گئی کہ صوبائی، علاقائی، مذہبی تفریق سے دور رہیں اور سارے باہم متحد ہو کر رہیں۔ کوئی سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی نہیں ہے سب ایک پاکستانی ہیں اخوت بھائی چارہ اور اتفاق کے فروغ کی تلقین ہوئی تھی مگر چند ہی سالوں کے بعد ہم اصل روح سے ہٹ گئے اور آپس میں تفریق کر لی صوبائی علاقائی اور مذہبی تفریق کو اپنے درمیان جگہ دے دی۔ جس کی وجہ سے ہمارا سماج کی جڑیں مضبوط ہونے کے بجائے دن بدن کم زور ہوتی جا رہی ہیں۔ ملک دشمن عناصر کی سازش کامیاب کروانے میں ہم نے بنیادی کردار ادا کیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے ہمارے سماج میں ہونے والی اس اخلاقی پامالی کو اپنے ایک کالم ”خالی قبروں میں خواب دفن ہیں“ میں گہری حقیقت کے ساتھ بیان کیا وہ لکھتے ہیں:

ذرا غور سے دیکھو ان قبروں کو دیکھو یہ جعلی نہیں خالی نہیں ہیں۔ ان کے اندر بہت سے خواب دفن ہیں۔ قومی یکجہتی کا خواب ایک قبر میں مسلمان ایک امت ہیں ایک اور خواب دفن شدہ خواب ہم ایک ہیں یہ وطن ہمارا ہے پاکستان قیامت تک رہے گا اب نہ کوئی پٹھان ہے، نہ کوئی سندھی، پنجابی یا بلوچ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ ہم سب پاکستانی ہیں

اس لیے بہت سے خواب ان بظاہر خالی قبروں میں دفن ہیں اب تو ہمارے پاس دفن کرنے کے لیے خواب بھی تھوڑے رہ گئے ہیں اور پھر بھی ہم اُن کے لیے بے شمار قبریں کھودتے چلے جاتے ہیں۔" (۵۸)

سماجی اقدار کی دوری سے ہمارا سماج تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہا ہے۔ مسائل تیزی سے بڑھ رہے ہیں اور ان کے عمل کے لیے کوئی راہ نظر نہیں آتی۔ ہماری ایک دوسرے سے دوری کو سماج عناصر دشمن کے ہماری کمزوری بنادیا جس کو وہ آلہ کار کے طور پر استعمال کر کے ہمارے سماج کو مزید کھوکھلا کر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اپنی روایات بہت تھوڑی رہ گئی ہیں اگر ان کی پاسداری ناکئی گئی تو ممکن ہے ہمارا وجود ختم ہونے کے قریب ہو جائے گا۔

## دکھاوا

دکھاوا یا ریاکاری اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے یہ انسان کے اعمال کو ضائع کر دیتا ہے اور ہمارے مذہب اسلام میں دکھاوا کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ دکھاوا ایک ایسا عمل ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے سزا مقرر کی ہے۔ دکھاوے کی غرض سے کیا گیا کوئی بھی عمل اللہ تعالیٰ کے حضور قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر پاتا یہ عمل بے کار جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

"اے ایمان والو! اپنے صدقہ اور (خیرات) احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اُس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔" (۵۹)

کسی بھی نیک کام میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی بجائے لوگوں کی واہ واہ حاصل کرنا اُن کی توجہ حاصل کرنا کسی طور پر درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے۔ علماء دین نے لکھا ہے کہ انسان کے اچھے اور نیک اعمال دو صورتوں میں قبول ہوتے ہیں پہلی صورت کے انسان جو بھی عمل کرے وہ عمل خالصتاً اللہ تعالیٰ کے لیے کیا گیا ہو اور دوسری صورت کہ انسان کا وہ عمل قرآن اور سنت کے عین مطابق ہو اگر انسان کا وہ عمل ان دو شرائط کے مطابق نہیں ہے تو وہ عمل قبول نہیں ہوگا۔ ریاکاری اور دکھاوا انسان کے کسی بھی بڑے عمل کو ضائع کر سکتا ہے اور ریاکاری کے بغیر انسان کا معمولی عمل بھی اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"جو لوگ اپنا مال لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت

کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور جس کا ہم نشین اور ساتھ شیطان ہو، بدترین ساتھی ہے۔" (۶۰)

اجر کی توقع مخلوق کی بجائے انسان کو اللہ تعالیٰ سے ہونی چاہیے اور اپنے عمل کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق سرانجام دے۔ ہمارے پاکستانی سماج میں کافی عرصے یہ چیز دیکھنے میں آرہی ہے کہ مخیر حضرات کی جانب سے غریبوں کی مدد کرتے وقت زیادہ سے زیادہ اس کا چرچا کروایا جاتا ہے۔ اس کے لیے تصویروں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ میڈیا میں اس ہمدردی کو لایا جاتا ہے۔ غریبوں اور مستحق لوگوں کی عزت نفس کو بری طرح سے مجروح کیا جاتا ہے۔ چھوٹی سی چھوٹی اشیاء کی تقسیم پر یہ فلاحی ادارے اور مخیر حضرات تصاویر لینے سے باز نہیں آتے ہیں۔ اکثر تصاویر میں مخیر حضرات کے چمکتے اور مسکراتے چہرے کے مقابل کسی غریب کا سر جھکا ہوا دیکھنے کو ملتا ہے۔ صابن سے لے کر سلائی مشین تک کی میڈیا میں تقسیم کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہوتا ہے۔ اس سے ان حضرات کی واہ واہ ہو جاتی مگر لینے والے لوگ آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے اور اپنی بے بسی کو جھکی نظر سے محسوس کرتے ہیں۔ ایسے عمل کرنے کا کوئی فائدہ نہیں جو معمولی سی بھی نمود و نمائش سے تعلق رکھتا ہو۔

مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم بیگمات اور سیلاب میں ہمارے مخیر حضرات کے اس دکھاوے کی عادت کی نشان دہی کرتے ہیں۔ کہانی میں دو کردار ایک دوسرے سے خیراتی کاموں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن کی گفتگو میں ہمارے سماج کی اس اخلاقی اقدار پامالی کا تذکرہ کچھ یوں نظر آتا ہے۔

"ہاؤ سوئیٹ لیکن آپ ابھی تک نان اور چاول غریب لوگوں میں تقسیم کیوں نہیں کیے۔"

ادھر کوئی فوٹو گرافر ہی دکھائی نہیں دے رہا۔۔۔

ہاں تصویر کے بغیر سوشل ویلفیئر کا کیا فائدہ آپ کی تصویر اخبار میں چھپے گی کہ بیگم یرقان سیلاب زدگان میں چاول تقسیم کر رہی ہیں۔ تو پورے ملک کو پتہ چلے گا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھے ہوئے بلکہ اپنے بہن بھائیوں کے دکھ درد میں اُن کا ساتھ دے رہے ہیں۔

تو اور کیا ورنہ تصویریں تو ہماری اترتی رہتی ہیں۔

آپ کے نان اور چاول پروگرام کا کیا ہو گا۔

فوٹو گرافر ہی نہیں آیا ابھی تک اس لیے تو میں گھر چلتی ہوں۔" (۶۱)

دکھاوا جیسی معاشرتی برائی ہمارے اخلاقی اقدار کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگوں کی عزت نفس مجروح ہوتی ہے۔ ہمارے سماج کا غریب طبقہ مزید احساس کمتری مبتلا ہو جاتا ہے۔ امیر طبقے کو اصل میں ان غریبوں سے ہمدردی نہیں ہوئی بلکہ وہ اپنی شان و شوکت کا رعب اور دبدبہ قائم کرنے کے لیے محض چند روپوں کی خیرات کے لیے لوگوں کی عزتوں کو خرید لیتے ہیں۔

## خاندانی نظام کا بکھرنا

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہمارے سماج میں بہت سی ہماری اخلاقی قدریں اپنا وجود کھوتی نظر آرہی ہیں۔ معاشی حالات بھی اس کی وجہ ہیں۔ پاکستانی سماج میں مضبوط خاندانی نظام کی مثالیں دنیا بھر میں مشہور ہیں مگر اب ہمارا خاندانی نظام آہستہ آہستہ بکھرتا جا رہا ہے لوگ معاش کے لیے اپنے سماج سے باہر کا رخ کرنے لگے ہیں۔ کیوں کہ یہ اب اُن کی ضرورت بن چکا ہے۔ بچے جب جوان ہوتے ہیں تو یا تو وہ اپنے معاش کے لیے شہر سے باہر جاتے ہیں یا وہ ملک سے باہر چلے جاتے ہیں اور کتنا کتنا وقت وہ واپس لوٹ کر نہیں آتے۔ ان کی شادیاں وہی پر ہو جاتی ہیں وہ وہاں سیٹل ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اُن کے بوڑھے ماں باپ ساری زندگی اُن کا انتظار کرتے کرتے اُن سے دوبارہ ملنے کا خواب آنکھوں میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ساری زندگی اولاد کے لیے محنت کر کر کے وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تنہائی میں گزارتے ہیں۔ اس حوالے سے مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "مجھے ایک جھنگیر چاہیے" اس میں لکھتے ہیں:

"مشرکہ خاندانی نظام اب متروک ہو تا جا رہا ہے۔ پاکستان میں کیا کوئی ایسا گھرانہ ہے جس کا کوئی ایک یا متعدد افراد غیر ممالک میں قیام پذیر نہ ہوں تعلیم کے لیے اور بہتر روزگار کے مواقع کے لیے بھی۔ اگر وہ غیر ممالک کو نہ سدھارے تو بھی وہ اپنے آبائی شہر یا قصبے میں نہیں ہوں کہ رزق کی تلاش اور ملازمت کی مجبوریاں انہیں کہیں اور لے جاتی ہیں۔" (۶۲)

پردیس جانے کے بعد اگر اُن کے ماں باپ تنہائی میں مرجائیں تو وہ اُن کے مرنے پر واپس گھر کو آتے ہیں یا تو اُن کی

اولادیں آنے سے پہلے اُن کے والدین کو دفنایا جاتا یا پھر سرد خانے مستقل کر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

"جن والدین کی اولادیں غیر ممالک میں مقیم ہیں۔ اُن کے مقدر میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ مرنے کے بعد وہ سیدھے قبرستان نہیں کسی ہسپتال کے سرد خانے میں جائیں گے اور انتظار کریں گے۔" (۶۳)

### مستنصر حسین تارڑ کے سماجی شعور کے امتیازات

ادیب اور سماج ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ادیب سماج سے کٹ کر رہ ہی نہیں سکتا ہے۔ وہ اپنے قلم کے ذریعے سماجی ناہمواریوں کو کہیں نا کہیں ضرور بیان کرتا ہے۔ باقی ادیبوں کی طرح مستنصر حسین تارڑ سماج کے مسائل، افراد کے رویے، مذہب، اخلاقی اقدار، سماجی اداروں کی کارکردگی، روزمرہ زندگی کے مسائل پر اپنی کالم نگاری میں پیش کیے۔ سماجی شعور کی پیشکش اتنے عمدہ انداز میں دکھائی دیتی ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مستنصر حسین تارڑ نے ہر شہر، ہر گھر میں افراد کے درمیان رہ کر ان کے طور طریقوں کو سمجھ کر بیان کیا ہے۔ جبکہ باقی کالم نگاروں کے ہاں سماجی موضوعات میں وسعت نہیں دکھائی دیتی۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں اُن کے سماجی شعور میں ایک ٹھراؤ نظر آتا ہے وہ کسی بھی مسئلہ کی پیشکش میں واویلا نہیں کرتے اور نا کسی واقعے پر فوراً رد عمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کی پیشکش کا انداز مثبت ہوتا ہے۔ وہ داد و تحسین کے بالکل قائل نہیں ہیں۔ اُن کا نکتہ نظر مضبوط اور ٹھوس دکھائی دیتا ہے۔

بدلتے وقت کے ساتھ مستنصر حسین تارڑ سماج میں پیدا ہونے والے حالات و واقعات پر پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا قلم کھلا ہے اور وسعت رکھتا ہے۔ ادب کے ساتھ صحافت میں بھی بھرپور کامیابی حاصل کی ہے۔ انھوں نے سماج سے تعلق رکھنے والے ہر مسئلہ کو اپنی قلم کی نوک میں سمویا ہے اور اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ بعض اوقات اپنے وسیع سماجی شعور کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے ایک تحریر کے اندر دو سے تین موضوع کو شامل کرتے ہیں۔ وہ اپنی پوری تحریر میں کہیں ہلکے طنز کے ساتھ اور کہیں گہرے طنز کے ساتھ اُس مسئلے کو نمایاں کر کے بات کا رخ کہیں اور موڑ دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ سماجی مسائل کی

پیشکش میں نہایت بے باک انداز اختیار کرتے ہیں اور ذمہ داران کے خلاف کھلے انداز میں تنقید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم اپنے ایک انٹرویو میں مستنصر حسین تارڑ سماجی شعور کے حوالے سے بیان کرتے ہیں۔

"مستنصر حسین تارڑ ایک آوارہ گرد روح ہے اُن کی تحریروں میں بے چینی ہے جیسے اُن کو کسی چیز کی تلاش ہو۔ اُن کے ہاں ہمیں قدم کے ساتھ قلم بھی چلتا دکھائی دیتا ہے۔" (۶۴)

مستنصر حسین تارڑ کے شعور کی یہ خوبی ہے کہ وہ کوئی ایسی بات کر کے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سنجیدہ مسئلے کے ساتھ ساتھ وہ مزاح کو بھی شامل کرتے ہیں۔ قاری کی نفسیات کو جانتے ہوئے لکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے کالموں میں کرداروں کے ذریعے کوئی بھی سماجی ناہمواری نمایاں کرتے ہیں اور اپنے کسی نا کسی کردار کے ذریعے اُسے زبان دیتے ہیں۔ "خلیفہ خلفشاری"، "فرقان اور یرقان" اُن کے کالموں کے کردار ہیں اور انھی کرداروں کے ذریعہ ہی کہانی بیان کرتے ہیں۔

"یار یہ پروٹوکول ہوتا میں نے پھر کہا۔ خلیفہ خلفشاری یہ پروٹوکول ہمارے ہاں ہی کیوں ہوتا ہے۔ انگلستان میں ہمارے صدر، وزیر اعظم جاتے رہتے ہیں وہاں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔" (۶۵)

باقی ادیبوں کے ہاں ہمیں کرداروں کے ساتھ اُن کے کالم نظر نہیں آتے بلکہ وہ جو دیکھتے ہیں بیان کرتے ہیں جبکہ تارڑ صاحب سماج کے افراد کی زبان سے ہی اُس چیز کو بیان کر دیتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور بہت منفرد انداز میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے دیگر کالم نگاروں کی طرح سماجی موضوع کا انتخاب روایتی انداز میں نہیں کیا بلکہ ان کے یہاں وہ موضوع بڑے ممتاز انداز میں نظر آتا ہے۔ معاشرے میں خواتین کا میک اپ کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے اور ہر کوئی جانتا ہے کہ خواتین میک اپ کرتی ہیں، لیکن اس موضوع پر بہت کم ہی لوگوں نے کالم لکھے یا پھر کسی کی توجہ ہی نہیں گئی۔ مستنصر حسین تارڑ سماجی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ کہیں جاتے ہوئے ایک کار قریب سے گزری جس میں کچھ خواتین اور بچے وغیرہ فروکش تھے، ایک شدید گندمی رنگ جسے عرف عام میں سیاہ رنگ بھی کہا جاسکتا ہے، خاتون ڈرائیونگ کر رہی تھیں، انھوں نے مجھے دیکھ کر زور زور سے ہاتھ ہلایا اور

مسکرائیں۔ میں نے سوچا کوئی فین ہیں۔ میں نے بھی جواب میں ہاتھ ہلایا اور کاغذ تیز کر کے چلا گیا۔ چند روز بعد ٹیلی ویژن کے برآمدے میں ایک خاتون نیوز ریڈر سے ملاقات ہوئی جو عام حالات میں نہایت خوشگوار ہوا کرتی تھیں، لیکن اس روز انھوں نے شدید بے رخی برتی۔ میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگیں "چھوڑیں تارڑ صاحب آپ نے تو میری بے عزتی کروادی۔ ایک روز میں اپنی کار میں چند عزیزوں کے ہمراہ جا رہی تھی۔ انھوں نے آپکو دیکھ لیا تو ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے کہا تارڑ صاحب تو میرے بہت اچھے جاننے والے ہیں۔ میں ملوادی ہوں۔ میں نے آپکو بار بار ہاتھ ہلایا، مسکرائی بھی اور رکنے کا اشارہ کیا، لیکن آپ نے بو تھی سجا کر ہماری طرف دیکھا، یونہی سا ہاتھ ہلایا اور چلے گئے۔ میری بے حد بے عزتی ہوئی۔ آپ رکے کیوں نہیں تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کار میں جو مشکلی رنگ کی خاتون تھیں یہی نیوز ریڈر تھیں۔ اب میں ان سے کیا کہتا کہ بی بی میں نے آپ کو جب بھی دیکھا، میک اپ میں حسین و جمیل دیکھا تو میں آپ کو پہچان ہی نہ سکا" (۶۶)

مستنصر حسین تارڑ ایک ایسے ادیب ہیں جو اگرچہ پاکستانی سماج کے حوالے سے سرگرم ہیں۔ وہ آئے روز اس سماج کے موضوعات کو اپنے کالم کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والے ادیب ہیں، لیکن جب بھی وہ کسی سماج کے موضوع کو اپنے کالم کا حصہ بناتے ہیں وہ بہت منفرد ہوتا ہے۔ اپنے ایک کالم میں مستنصر حسین تارڑ نے کرکٹ کھیل کے فروغ کے نتیجے میں بقیہ کھیلوں کا ختم ہو جانے کے حوالے سے بہت خوبصورت لکھا ہے کہ کیسے آج پاکستان میں ہر ایک کی زبان پر بس کرکٹ کا نام ہے اور اس کے علاوہ کوئی کسی کھیل کا نام لے ہی نہیں رہا۔ عام طور پر جب ہم دیکھتے ہیں تو ایسے موضوع پر بہت کم یا پھر لکھنے والے ہوتے ہی نہیں۔ اگر ملک میں کرکٹ کا ڈھنڈورا پیٹھا جا رہا ہو تو اگلے روز اخبار میں اس حوالے سے توصیفی کالم پڑھنے کو ملتے ہیں، لیکن یہ مستنصر حسین تارڑ ہیں جنھوں نے اس بات کو محسوس کیا کہ بقیہ بھی کھیل ہیں اور ان کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اپنے کالم "کرکٹ کی ڈائن بقیہ کھیلوں کو کھا گئی" میں وہ لکھتے ہیں:

"کرکٹ ایک ایسی ڈائن ہے جو پاکستان میں دیگر کھیلوں کو کھا گئی ہے۔ ایسے کھیل جن میں کرکٹ سے زیادہ ہنرمندی اور تکنیک، بے جگری اور ٹیلنٹ درکار ہے۔ ایسے کھیل جن کی کوئی سرپرستی نہیں کرتا اور ان کھیلوں میں کمال حاصل کرنے والے تینوں کی مانند

در بدر ہوتے ہیں اور کوئی انھیں پوچھتا، نہ اخبار ان میں دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ میڈیا منہ لگتا ہے" (۸۷)

مستنصر حسین تارڑ جب کبھی کسی سماجی ضرورت یا مسئلے کو دیکھتے ہیں اور اس کے بعد اسے اپنے کالم کا موضوع بناتے ہیں وہ اس تاریخ میں چھپے بقیہ تمام کالموں سے وہ مختلف ہوتا ہے۔ وہ کسی سماجی مسئلے یا بڑی انفرادیت سے بیان کر دیتے ہیں اور انکا انتخاب موضوع بے حد شاندار و جاندار ہوتا ہے۔ شہباز شریف جب پنجاب کے وزیر اعلیٰ تھے اس دوران انھوں نے پنجاب میں ایک فورس کا آغاز کیا تھا جسے "ڈولفن فورس" کا نام دیا گیا تھا اور وہ آج بھی موٹر سائیکلوں پر لاہور کی سڑکوں پر دندناتی پھرتی ہے۔ حکومت کی اس فضول و شاہانہ خرچی پر مستنصر حسین تارڑ نے بڑا خوبصورت کالم لکھا ہے جس پر بقیہ کسی کالم نگار کو توفیق نہ ہوئی اور جنھوں نے لکھا وہ بھی بس اس فورس کی توصیف و تعریف میں ہی کہ انھوں نے اس فورس کو وقت کی ضرورت سمجھا۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے طنزیہ کالم کے عنوان "موٹر سائیکل چلانے والی ڈولفن مچھلیاں" میں لکھتے ہیں:

"آپ جانتے ہوں گے کہ ڈولفن فورس چھوٹے میاں صاحب حال مقیم لنڈن برائے علاج معالجہ کا "برین چائلڈ" ہے یعنی یہ ان کے دماغ کا بچہ ہے اور یہ بچہ بھی ایسا ہے جو استنبول سے اغوا کیا گیا ہے۔ میاں صاحب یعنی برادر خورد نے شید ہے کہ استنبول میں اس نوعیت کی بنی ٹھنی یونہی ہارن بجاتی ڈولفن فورس دیکھی تو اس پر دل و جان سے فدا ہو گئے۔ وطن واپسی پر پہلی فرصت میں جوں کی توں شکل کی وردی میں اس کی تشکیل کا حکم جاری کیا جس پر جنگلہ بس جتنے تو نہیں اس کے قریب قریب کے اخراجات اٹھے" (۸۸)

سماج میں جو کچھ ہو رہا ہوتا ہے ادیب اور لکھاری اسے محسوس کرتا ہے اور اسے اپنا موضوع بنا کر اس پر کچھ نہ کچھ اظہار کرتا رہتا ہے۔ امر جلیل جو جنگ اخبار میں کالم لکھتے ہیں مشہور و معروف کالم نگار ہیں۔ انھوں نے اردو زبان کی حفاظت کے حوالے سے ایک کالم لکھا جس میں وہ اردو زبان سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اپنے کالم "اردو کی حفاظت کون کرے؟" میں وہ لکھتے ہیں:

"میں نے کئی مرتبہ لکھا ہے، اپنے لیکچرز میں کہا ہے کہ اردو ایک کرشماتی، ایک سیمائی، ایک طلسماتی اور معجزاتی زبان ہے۔ ایسی زبان پر کوئی بھی اجارہ داری کا دعویٰ نہیں کر

سکتا۔ ایسی زبان کو آپ اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتے۔ اردو کی حفاظت کے نام پر اردو کے لیے آپ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر آپ اردو کو اپنے قبضے میں نہیں رکھ سکتے" (۶۹)

اس سے ملتے جلتے موضوع پر مستنصر حسین تارڑ نے ہفت وار اخبار جہاں میں "کتاب زندہ ہو گئی ہے" کے نام سے کالم لکھا ہے۔ ان کا کالم اگرچہ براہ راست اس موضوع پہ تو نہیں کہ اردو کی حفاظت کون کرے یا اردو ختم ہو گئی، لیکن ان کے کالم کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کی محبت میں لکھ رہے ہیں۔ وہ اپنے کالم میں اردو زبان کے فروغ اور اس کے شیدائیوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے چند اردو عشاق نے ایک ویب سائٹ "ریختہ" نام کی شروع کر رکھی ہے۔ کروڑوں روپے کی صرف عشق کی انویسٹمنٹ ہے جس میں کچھ نفع نہیں، سینکڑوں لوگوں کا ٹاف دن رات اسے اپ ٹو ڈیٹ کرنے میں مشغول ہے۔ آپ کسی بھی غزل کا پہلا مصرعہ ٹائپ کر دیجیے۔ پوری غزل آپ کے سامنے آ جائے گی۔ اردو کلاسیک کے علاوہ جدید ادب کی سینکڑوں کتابیں آپ ایک کلک کر کے سکرین پر پڑھ سکتے ہیں لیکن یہ "ریختہ" والوں کا کہنا ہے کہ جب بھی کوئی کتاب پڑھنے والے کے ذوق جمال کے معیار پر پوری اترتی ہے، وہ شخص اسے روایتی شکل میں ضرور خرید کر لے آتا ہے" (۷۰)

مستنصر حسین تارڑ نے جتنے بھی سماجی موضوعات پر کالم لکھے ہیں ان میں بقیہ کالم نگاروں کی نسبت بہت انفرادیت پائی جاتی ہے۔ ان کے کالموں کے موضوعات ادب اور زندگی کے تجربات و اسفار پر مشتمل ہوتے ہیں، انھوں نے جب سماج میں کوئی ایسی برائی یا موضوع دیکھا ہے اس پر جب بھی لکھا ہے بہت منفرد اور خوبصورت لکھا ہے۔ انھوں نے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جس کی طرف دیگر کالم نگاروں کی توجہ اول تو گئی ہی نہیں یا پھر بہت کم گئی ہے۔

## حوالہ جات

۱۔ <http://www.mimirbook.com> 18 june 2022, 8:00 am۔

۲۔ قراۃ العین اعظم، حمید شاہین کی شاعری میں سماجی شعور، مقالہ برائے ایم فل، اردو، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۴

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۳۳

۴۔ ایضاً

۵۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶۹-۶۸

۶۔ ایضاً، ص ۷۰

۷۔ ایضاً

۸۔ ایضاً، ص ۲۹

۹۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۴، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۷

۱۰۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۲، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۵

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، جلد ۶، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۲۰۶۔

۱۳۔ <http://ur.m.wikipedia.org>, 18 June 2022, 10:05 pm۔

۱۴۔ قراۃ العین اعظم، حمید شاہین کی شاعری میں سماجی شعور، مقالہ برائے ایم فل، اردو، نمل، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء

۱۵۔ <http://urdunews.agency>, 18 june 2022, 11:38 pm۔

۱۶۔ احمد اقبال، مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۱۵-۲۰۱۴ء، ص ۱۱۵

۱۷۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء، ص ۲۱۵

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۳۷

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۳۸-۱۳۷

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ [www.oxforddictionaries.com/definition/american.english/corruption](http://www.oxforddictionaries.com/definition/american.english/corruption)

۲۲۔ شمشاد احمد، کرپشن کی لعنت (کالم)، مشمولہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۹ء

۲۳۔ ایضاً

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ، چک چک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۳-۲۱۲

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ رابعہ رحمن، قانون کی پاسداری اور معاشرے کی ذمہ داری، (کالم)، مشمولہ روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد،

۱۱ مارچ ۲۰۱۸ء

۲۷۔ ایضاً

۲۸۔ مستنصر حسین تارڑ، الوہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۷۰

۲۹۔ ایضاً

۳۰۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۳۱

۳۱۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۵، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۵

۳۲۔ مستنصر حسین تارڑ، الوہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۰

۳۳۔ ایضاً، ۲۱۹

۳۴۔ ایضاً

۳۵۔ ایضاً

۳۶۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۴، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۹۵

۳۷۔ ایضاً، ۲۹۶

۳۸۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۲۶

۳۹۔ ایضاً، ص ۲۷

۴۰۔ ایضاً، ص ۲۸

۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ، الوہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۸۴

۴۲۔ ایضاً، ص ۸۵

۴۳۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۴۴۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۳-۳۲

۴۵۔ ایضاً، ص ۳۳

۴۶۔ ایضاً، ص ۸۷

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ایضاً، ص ۸۸-۸۷

۴۹۔ ایضاً

۵۰۔ ایضاً، ص ۱۷۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۵، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۷

۵۳۔ قراۃ العین اعظم، حمید شاہین کی شاعری میں سماجی شعور، مقالہ برائے ایم فل اردو، نمل اسلام

آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۴۹

۵۴۔ مستنصر حسن تارڑ، تارڑ نامہ ۴، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۳

۵۵۔ ایضاً، ص ۵۴

۵۶۔ ایضاً

۵۷۔ ایضاً، ص ۵۵

۵۸۔ مستنصر حسن تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۷

۵۹۔ القرآن، البقرہ، سورۃ نمبر ۲، آیت نمبر ۲۶۴

۶۰۔ القرآن، النساء، آیت نمبر ۳۷

۶۱۔ مستنصر حسین تارڑ، الوہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۲۲۴

- ۶۲۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸۰
- ۶۳۔ ایضاً، ص ۲۸۱
- ۶۴۔ غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو)، لاہور، ۱۱ اگست، ۲۰۲۲ء بجے دن
- ۶۵۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۳
- ۶۶۔ ایضاً، ص ۲۶-۲۵۔
- ۶۷۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۷، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۳۵
- ۶۸۔ ایضاً، ص ۶۵۔
- ۶۹۔ امر جلیل، اردو کی حفاظت کون کرے؟ (کالم)، مشمولہ روزنامہ جنگ، ۴ جنوری ۲۰۲۲ء۔
- ۷۰۔ مستنصر حسن تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸

## باب سوم:

### مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور

سیاست افراد، حکومت اور ریاست کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے۔ سیاست براہ راست سماج کے ہر فرد سے تعلق رکھتی ہے۔ کسی بھی ریاست کی حکمت عملی یا منصوبہ سازی اُس ریاست کی سیاسی پارٹیوں، جماعتوں یا گروہوں کے طریقہ کار، معاملات سیاست، افراد کے سیاسی رابطے سیاست میں ہی آتے ہیں۔ لفظ سیاست کی تعریف مختلف کتابوں میں کچھ یوں درج ہے۔ مولانا گوہر رحمن اپنی کتاب اسلامی ریاست میں سیاست کی تعریف میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"سیاست بردزن امارت ساس یوس بر وزن قال یقول سے مصدر کا صیغہ ہے۔ اس باب کا مصدر سوس قول بھی آتا ہے۔ سیاست اور سوس کے اساسی معنے میں اصلاح کرنا اور سنوارنا۔ اس لغوی مفہوم کی مناسبت سے یہ دونوں ریاست و حکومت اور تدبیر مملکت کے معنوں میں بھی بکثرت استعمال ہوتے ہیں اس لیے کہ حکومت اور ریاست کا مقصد بھی عوام کی حالت سنوارنا اور اصلاح کرنا ہوتا ہے۔" (۱)

سیاست کا لفظ لغوی معنوں میں حکومت اور ریاست کا انتظام، نظم و نسق برقرار رکھنا اور ریاست کی حفاظت میں لیے جاتے ہیں اور اصطلاح میں بھی لفظ سیاست اسی مفہوم کے اندر آتا ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں لفظ سیاست کا معنی کچھ یوں لکھا ہے:

"ملک کی حفاظت و نگرانی، حکومت و سلطنت، انتظام ملک، بندوبست، دار کبر، نظم و نسق، تنبیہ، دھمکی، مار پیٹ، گوشالی، رعب دار، خیر و عذاب، خوف و دہشت، سخت گیری۔" (۲)

شان الحق حقی فرہنگ تلفظ میں لفظ سیاست کی تعریف درج ذیل معنوں میں کرتے ہیں:

"سزا، پاداش، حکمرانی، حکمت عملی، امور ملکی، ریشہ دانی، جوڑ توڑ، حصول اقتدار اور تحفظ مفادات کے لیے جدوجہد۔" (۳)

درج بالا تعریفوں سے ثابت ہوتا ہے کہ لفظ سیاست کے مطالب حکومت ریاست اور عوام کے تعلقات پر

مشتمل ہے۔

سیاست انسانی معاشرہ کا حصہ ہے۔ یہ وہ شعبہ ہے جس میں ایک معاشرے کے نظم و نسق کو بہتر انداز میں چلانے کے لیے ایسے اداروں کو بنایا جاتا ہے جو ملکی انتظام کو چلا سکے اور کاروبار حکومت کی بنیاد رکھ سکے اور اُس کو آگے بڑھا سکیں۔ آغاز سیاست بھی اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی معاشرہ دنیا کے کسی بھی خطے میں بنتا ہے معاشرے کے وجود میں آنے کے بعد وہاں کے افراد کو اس بات / امر کی ضرورت پیش آتی ہے کہ کوئی ایسا نظام یا ضابطہ موجود ہونا چاہیے جو معاشرے میں توازن برقرار رکھ سکے اور اُس نظام یا ضابطہ کے تحت معاشرے کے افراد ایک بہتر اور احسن طریقہ کار سے اپنی اجتماعی زندگی بسر کر سکیں۔ اب اس نظام اور ضابطہ کا معاشرے میں موجود افراد پر اطلاق کیا جاتا ہے اور اطلاق کے اس عمل کے لیے کسی بھی ایسے ادارے کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا ہے جو عوام سے اُس ضابطہ پر عمل درآمد بھی کروائے تب ہی اُس معاشرے کے افراد کچھ لوگوں کو منتخب کرتے ہیں اور ان امور کو انجام دینے کے لیے اُن کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں جو اُس معاشرے کے حکومت کے متعلق ہوتے ہیں۔

معاشرے میں رہنے والے ہر شخص کی قوت اقتدار کی حصول کی آرزو ہو سکتی ہے مگر یہ قوت چند منتخب افراد کے حصے میں آتی ہے جن کو معاشرے کے افراد کسی نہ کسی قابلیت یا خصوصیات کی بنا پر منتخب کرتے ہیں۔ باقی تمام افراد اُن منتخب شدہ افراد کی سرگرمیوں پر نظر رکھتے ہیں اور اپنی قوت کے مطابق اُن کی خامیوں اور خوبیوں کو اپنی تنقید اور تحسین کے ساتھ نمایاں کرتے ہیں معاشرے میں موجود ہر شخص اہل اقتدار کے طریقہ کار پر بات کرتا ہے کبھی کبھار وہ کسی تبدیلی کو چاہتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی سیاسی سرگرمی کا حصہ بنتا ہے یوں معاشرے کے تمام افراد سیاست میں کسی نا کسی طرح اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔

اس طرح کسی بھی معاشرے کا سیاسی عمل آگے بڑھتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ دنیا کے خطوں پر رہنے والے معاشروں کی سیاست ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے اور اُن کے سیاسی مقاصد بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان معاشروں میں موجود سیاسی جماعتوں کی سیاست ایک جیسی نہیں ہوتی ہے اور اُن کے لائحہ عمل ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی بھی معاشرے میں تمام سیاسی امور کو چلانے والے افراد کو سیاست دان کہا جاتا ہے۔

## سیاست اور ادب کا تعلق

ہر دور میں سیاست اور ادب کا چولی دامن جیسا ساتھ رہا ہے۔ اگر اردو ادب کو پڑھا جائے تو بہت سے

ادیبوں نے اپنے اپنے ادوار میں سیاسی سرگرمیوں اور سیاسی اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے اور جو اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی بھی دور کے ادب پر اُس دور کی سیاست براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ کسی بھی ادیب کی تحریر کسی نا کسی طرح معاشرے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اُس تحریر کے پیچھے کوئی نا کوئی سیاسی عمل کار فرما رہا ہو۔ سیاست اور ادب بظاہر تو دو الگ الگ دائرہ کار ہیں مگر ان دونوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ادب کا تعلق بھی معاشرے کے افراد سے ہوتا ہے اور سیاست کا تعلق بھی معاشرے کے افراد کے ساتھ ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں غالب، میر تقی میر، جالب، فیض احمد فیض کی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ کسی بھی دور کا ادب اپنے دور کی سیاست سے بے خبر نہیں رہا بلکہ اُس کے سیاسی اثر کو قبول کیا ہے۔ ادب سے ہی گزرے وقت کو آگے منتقل کیا جاتا رہا ہے۔ دہلی کے اجڑنے کا قصہ ہو یا ہندوستان پر غیر ملکی تسلط ہو وہاں کے سیاست دانوں کی آپسی چپقلش، ذاتی مفادات کی جنگ، خوشامدی یا بیرونی تسلط کی قبولیت حصول آزادی کی جنگ اُس سے پیدا شدہ صورت حال شہروں کا اجڑنا ہو یا سیاسی چال بازیوں کا تذکرہ ۱۸۵۷ء کی جنگ کے اثرات اور پھر تقسیم ہندوستان کے نتیجے میں ہونے والے مسائل یہ سب ادب میں محفوظ ہوا ہے جس کو ادیبوں نے اپنی تحریروں میں سمویا ہے اور اُس کو اگلی نسلوں تک منتقل کیا ہے۔ مزاحمتی ادب کا اکثر حصہ اُس دور کے سیاست دانوں کے رویے جات اُن کی عوام دشمن پالیسیوں کی وضاحت اور اُن کے خلاف آواز اٹھانے کا ذریعہ بنا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ادب بے شک وہ کسی بھی دور کا ہو

اپنے دور کا بہترین ترجمان ہوتا ہے۔ بقول راجندر سنگھ بیدی

"ادب سیاست سے الگ نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک پامال مضمون ہے اور یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ

ادب کا سیاست سے چولی دامن کا ساتھ ہے،" (۴)

کوئی بھی ادیب اپنے ماحول کی سیاسی فضا سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ادیب کسی بھی معاشرے کا حساس اور ذمہ دار فرد ہوتا ہے۔ ادیب اپنے دور کی سیاسی صورت حال سے متاثر ہو کر جب اپنی تحریر سامنے لاتا ہے تو وہاں ادب اور سیاست دونوں ایک ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ایک ادیب کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور کے سیاست کے سماج پر اثرات کو درست قابلوں میں ڈھال کر ادب میں پیش کرے۔

اردو ادب میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ مصنفین کی تحریروں نے اس وقت کے سیاسی حالات کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُن کی تحریروں نے یہ بات ثابت کی کہ کسی بھی دور کا ادب اپنے عہد کے سیاسی

حالات و واقعات اور اتار چڑھاؤ سے بے خبر نہیں رہا۔ انیس باقر اپنے ایک بلاگ ”رشتہ ادب اور سیاست کا“ میں ادب اور سیاست کے تعلق کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”عہد بہ عہد کسی حد تک ادب اور سیاست کے رشتے کی اہمیت اور انسانی شعور پر ادب کے اثرات سے انکار مشکل ہے۔“<sup>(۵)</sup>

ادب اور سیاست ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کا تقریباً ہر پہلو کی کڑی کسی نہ کسی طرح اُس دور کی سیاست سے ملتی ہے۔ سیاست زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہے۔ ادب انسانی زندگی کے کسی بھی شعبے کو نظر انداز نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے بغیر ادب کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔

انسانی وجود کے بغیر سیاست کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اور نہ ہی کوئی ادب انسان سے لا تعلق رہ سکتا ہے۔ زندگی کے تمام شعبوں کا مرکز انسان ہی ہے۔ ایسے ہی سیاست اور ادب کا تعلق اس مرکز پر آکر قائم ہوتا ہے اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب انسانی زندگی سے ہی حسن پاتا ہے اور انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ سیاست پر مشتمل ہوتا ہے جو ادب پر براہ راست اپنا اثر ڈالتا ہے۔ زمانے کے بدلتے تقاضوں کے مطابق ادب پر نہ صرف اس سماج کی سیاست اثر انداز ہوتی ہے بلکہ بین الاقوامی سیاست بھی اُس ادب کو متاثر کرتی ہے جو اس ادب کا حصہ بنتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ عہد میں سیاسی عوامل ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

## پاکستان کے سیاسی حالات

۱۹۴۷ء میں وجود میں آنے والی اس مملکت خداداد میں سیاسی حالات ہمیشہ ہی ابتری کا شکار رہے ہیں۔ سیاسی چپقلش، سیاسی ناہمواریاں، ذاتی مفادات کی پوجا، ملکی مفادات سے گریز، سامراجی قوتوں کی آج تک دخل اندازی، فوجی آمریت، حکمرانوں کی عیاشیاں، قانون کی کمزوری، ملک کی کمزور معاشی حالت، حکمرانوں کی کرپشن اور اُن کی نااہلی عوام کی عدم دلچسپی، ذہنی غلامی، کمزور اور محکوم خارجہ پالیسی، کٹھ پتلی حکومتوں کا اقتدار میں آنا، بااثر افراد کی ذاتی دشمنی اور حکمرانوں کی کرپشن نے سیاسی طور پر اس مملکت خداداد کو کبھی مضبوط ہونے نہیں دیا۔ ایک سیاسی جماعت کے اقتدار سے الگ ہو جانے پر دوسری جماعت میں اقتدار آکر پہلے والی جماعتوں کی خامیوں اور کمیوں پر روتے روتے اپنی معیاد حکومت بھی ختم کر دیتی ہے۔ مارشل لاء، نسل در نسل اقتدار کی منتقلی، ذاتی مفادات کو ملکی مفادات پر اہمیت دینا، بیرونی قوتوں کا ہمیشہ سے پاکستانی سیاست پر دباؤ، حکومتوں کا بدلنا، اپوزیشن کا

ملکی سیاست میں مثبت کردار ادا نہ کرنا ان سب عناصر نے کر پاکستان کو سیاسی طور پر کبھی مستحکم نہیں ہونے دیا۔ اسی سیاسی صورت حال نے قوم کو کبھی ایک متحد اور مضبوط پلیٹ فارم پر جمع نہ کیا اور نہ ہونے دیا اور نہ ہمارے سیاست دانوں نے اُن کے اندر شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ سیاسی منظر نامے ہمیشہ سے دھندلا ہی رہا۔ صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی قوت ختم کر دی۔ سیاسی حوالے سے عوام میں مختلف گروہ اور فرقوں نے جنم لے لیا۔

اپنے سیاسی رہنما کے غلط فیصلے بھی اُن کو درست معلوم ہوتے ہیں اور دوسری جماعت کے رہنماؤں کے درست فیصلے بھی غلط معلوم ہوتے ہیں نہ تو کبھی عوام متحد ہو سکی اور نہ ہی سیاست دانوں نے ایک دوسرے کا احترام کر کے مثبت انداز سے ملک کو سیاسی طور پر مضبوط کیا۔ البتہ جہاں اُن کو اپنے ذاتی مفاد نظر آئے انھوں نے فوراً سے اپنی روش ترک کی اور ذاتی مفاد کے حصول کے لیے اکٹھے ہو کر اقتدار میں موجود حکومت کے لیے خطرہ بن گئے۔ اُن کا یہ اتحاد تب ٹوٹا جب وزارتوں کی تقسیم میں اونچ نیچ ہو جائے تو پھر ان کی الزامات تراشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس ذاتی مفاد کی سیاست نے پاکستان کو کبھی مضبوط بنیادیں فراہم نہیں کی۔ اپنے پرائے سب چالوں میں مصروف رہے۔ بند کمروں کی سیاست اور وہ ادارے جن کو غیر جانب دار رہ کر ملکی مفاد کے لیے کام کرنا تھا سیاست میں اُن کی شمولیت سے سیاسی حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ جس سے عوام کے اندر بے سکونی اور ناامیدی نے جنم لینا شروع کر دیا۔ ابتداء سے ہی اس سیاسی بحران پر قابو پانے کے بجائے اس میں مزید ترقی ہوتی گئی۔

حکمران مارشل لاء اور نام نہاد جمہوریت کے علاوہ مذہب کے نام کو استعمال کرنے والے مولوی حضرات نے بھی سیاسی بحران کو برقرار رکھنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ مذہبی جماعتوں نے کبھی کسی مسئلے یا مذہبی فرقہ بندی کی روک تھام کے لیے عملی طور پر کام نہیں کیا۔ اخلاقی طور پر ہمارا معاشرہ کبھی اُن کو نظر نہ آیا۔ لیکن اُن کی شاطر نظریں ہمیشہ قانون اور اسمبلی پر رہی۔ کہیں کوئی ایسا قدم نہ اٹھ جائے جو اُن کی مذہبی ٹھیکیداری کو ختم کر دے۔ کوئی بھی ایسا مسئلہ جس پر ان مذہبی جماعتوں کو آگے بڑھ کر اُس پر بات کرنی چاہیے۔ اُس کے عمل کے لیے دینی تعلیمات کی روشنی میں مثبت اور مفید کوشش کرنی چاہیے۔ وہاں یہ جماعتیں بالکل خاموش رہتی ہیں۔ البتہ یہ جماعتیں لوگوں کو بے وقوف بنانے، اُن کی برین واشنگ اور اُن کے مذہبی جذبات کو ابھارنے کے لیے اور اُن کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے لیے بہت محنت سے کام کرتی ہیں۔ علاوہ ازیں معاشرے میں بد امنی میں پس پردہ رہ کر بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ پاکستانی معاشرے میں بڑھتی ہوئی فحاشی و عریانی، بڑھتے ہوئے جرائم کی

شرح اخلاقی پامالی کی زبانیں بند کر رہی ہیں۔ حالانکہ ان مسائل کو بنیاد بنا کر ماضی میں ان نام نہاد مفاد پرست مولویوں نے ایک سیاسی رہنما کو اقتدار سے الگ کیا تھا اور بیرونی اشاروں پر ناچتے ہوئے اُس کو موت کے تختہ پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔

کچھ مذہبی جماعتیں جو اکثر و بیشتر ملک کی شاہراہیں بند کر کے ملکی املاک کو نقصان پہنچا کر اور غریبوں کی گاڑیوں کو آگ لگا کر یا تو بین رسالت کا بدلہ غریبوں سے لینے میں یا اپنا غصے کا اظہار ملکی املاک کو جلا لینے اور حکومت سے مذاکرات کے بعد وہ اپنا مقصد بھول جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ مذہبی جماعتوں کا سیاست میں جھکاؤ اپنے مفادات کی طرف رہا ہے۔ ملک میں موجود کسی بھی سنگین مذہبی معاملہ میں زیادہ تر خاموشی مذہبی جماعتوں کی طرف سے سامنے آتی ہے فرقہ بندی سودی نظام سے پیدا ہونے والے مسائل پر ان مذہبی ٹھیکداروں کی زبانیں ہمیشہ بند رہیں اور جہاں بات مفادات کے خطرے کی ہو وہی مذہبی جماعتیں لوگوں کو جذباتی طور پر استعمال کرتی ہیں اور جب مفادات کو درپیش خطرات ختم ہو جائیں تو سیاست میں جن کے مخالف ہوتے ہیں بعد میں اُن کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں پاکستان کی ایک مذہبی سیاسی جماعت کے بارے میں محمد نور الامین اپنے ایک بلاگ میں لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی خود کو ملک کی سب سے منظم اور بڑی مذہبی سیاسی جماعت کہلوانے کی ہمیشہ سے کوشش میں ہے جب بھی ضرورت پڑی تو مذہبی نظریات و تفریق کے مسائل میں اس جماعت نے خاموشی کے سوا کچھ نہیں کیا۔" (۶)

ملک میں موجود دیگر مذہبی سیاسی جماعتوں کے رویوں اور مذہبی نوعیت کے ملکی معاشرتی مسائل کے بارے میں خاموشی پر نور الامین اپنے اسی بلاگ میں مزید لکھتے ہیں:

"جمعیت علمائے اسلام کے متعدد گروہ ہیں جو مذہب کے نام پر سیاست پر ہیں اور خود تو ایک ایک دود دو قومی اور صوبائی نشستوں کے عوض حکومتی جماعتوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں لیکن تفرقہ ختم کرنے میں ایک آنے کا کام ان کے کریڈٹ پر نہیں۔" (۷)

ملک میں موجود دیگر مذہبی سیاسی جماعتوں کی اصلاح معاشرہ کے حوالے سے سیاست میں رہ کر کوئی خاص کارکردگی ستر سالوں میں نظر نہیں آتی۔ ہمیشہ ہی سیاست میں اپنے ذاتی مفاد کو ان شکم پرست مذہبی رہنماؤں نے

اہمیت دی ہے۔ مذہب کو صرف اور صرف ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ملک میں موجود مذہبی تفرقہ جات اتحاد کی کمزوری، مذہبی انتہا پسندی، سودی نظام، اسمبلیوں اور اقتدار میں رہ کر بھی ان کو نظر نہیں آتا۔ اس ملک میں مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہوتے لوگ نظر نہیں آتے جبکہ کشمیر میں بھارتی مظالم یاد آتے اور عوام کو جہاد کی ترغیب دلا کر ان میں شمولیت کے لیے اکساتے ہیں۔ ستر پچھتر سالہ سیاست میں ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کا کردار محض اپنے مفاد کی پوجا تک رہا اور مذہب کو صرف اپنے مفادات کے حصول کا ایک راستہ بنایا۔

پچھلے پچھتر سالوں میں سیاسی ابتری اور عوام کی سیاسی تقسیم پاکستانی سماج کی افراتفری کی بنیادی وجہ ہے۔ پاکستانی قوم کو پنجابی، سندھی، بلوچی سے نکال کر سیاسی طور پر تین بڑے گروہ میں تقسیم کر رہا ہے۔ ان گروہوں کے افراد ایک دوسرے سے سیاسی نظریات کی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو ان گھٹیا القابات سے پکارتے ہیں۔ سیاسی غلامی اور ذہنی پستی کا عالم ہے کہ ایک دوسرے کے لیڈران کے غلط کاموں کو بھی درست ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔

سیاست دانوں نے عوام کو سیاسی سطح پر تقسیم کر دیا ہے مگر بد قسمتی سے اس سیاسی تقسیم کے بعد حالات بہتر ہونے کے بجائے مزید بگڑ رہے ہیں۔ لوگوں میں اتفاق نہیں رہا۔ سیاسی اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ پاکستان میں ابتدا سے لے کر ۲۰۲۲ء تک سیاسی طور پر مستحکم پاکستان ہونے کے امکانات کم ہی دکھائی دیے۔ آج کی صورت حال دیکھ کر یہ امکانات مزید کم دکھائی دے رہے ہیں۔ حکمرانوں کی لڑائی روز اول کی طرح آج بھی جاری و ساری ہے۔ جو حالات پیدا ہو رہے ہیں ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل میں بھی سیاسی حالات بہتری کی طرف نہیں جارہے۔ عوام کی سوچ، سمجھ اور سیاسی شعور حکمرانوں کی سیاسی وفاداریوں، ذہنی پستی اور آپس کی لڑائیوں کی نظر ہو جاتا ہے۔ امتیاز عالم روزنامہ جنگ میں انگلینت کے نام سے شائع ہونے والے اپنے ایک کالم میں پاکستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کے متعلق لکھتے ہیں:

"اب وہ وقت ہے جب سیاست دان ہی تمام تر حالات کے ذمہ دار ہوں گے۔ ان کی باہم لڑائیاں ریڈلائز کر اس کرتی رہیں تو پھر کسی جماعت اور خود جمہوریت کا کوئی مستقبل نہیں ہو گا۔" (۸)

سیاسی قائدین کے یہ رویہ جات عوام کے اندر مزید مایوسی بڑھنے کا سبب بنتے ہیں۔ سیاسی قائدین کے اندر

ایک دوسرے کے سیاسی نظریات کو برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ ایک دوسرے کو عوامی اجتماعات کے اندر غلیظ زبان کے ذریعے عوام کو تقسیم کرواتے ہیں دور جدید کی پاکستانی سیاست میں سیاسی قائدین ایک دوسرے پر الزام تراشیوں اور مختلف قسم کے گھٹیا القابات سے نوازتے ہیں سیاسی حوالے سے ہم دنیا کے لیے محض ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ حکمرانوں کی اسی روش کے متعلق محمد اکرام چوہدری نوائے وقت اخبار کے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں مخالف سیاسی جماعت کے قائدین اور ووٹرز کو نامناسب انداز میں مخاطب کیا جاتا ہے۔ کیا کسی کے سیاسی نظریات کی حمایت نا کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ اُسے منفی انداز سے پکارنا شروع کر دیں۔ بنیادی طور پر یہ قوم کو تقسیم کرنے کی خطرناک مہم ہے۔ سیاسی جماعت کے قائدین کی اگرچہ روش برقرار رہی تو نفرت بڑھے گی۔" (۹)

ہمارے حکمرانوں کے موجودہ سیاسی رویوں کی وجہ سے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے تصور کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ حکمرانوں کے آپسی تضادات، مفاد پرستی ختم نہیں ہو رہی۔ دور جدید کی سیاست اور سیاسی رویوں کو دیکھ کر ایک ہی بات سمجھ آتی ہے کہ ہماری سیاست محض الزامات، گالی گلوچ، گھٹیا القابات، عیاشیوں، نسل در نسل اقتدار کی منتقلی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ حکمرانوں نے ان رویوں سے ملکی سلامتی کے اداروں کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ ۲۲ جولائی ۲۰۲۲ء کے ایکسپریس کے ادارے میں ادارے نگار لکھتے ہیں:

"ملک میں سیاسی استحکام کے امکانات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی محاذ آرائی کا رخ اب سیاست دانوں کے مابین بیان بازی الزام تراشی اور گالم گلوچ سے نکل کر اداروں کے بارے میں ایسی گفتگو کی جا رہی ہے جس کی وجہ سے پورا سیاسی ماحول بد نظمی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا ہے۔" (۱۰)

ملک کے یہ سیاسی حالات عالمی طور پر پاکستان کو بدنام اور تنہا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ عالمی قوتیں ہمارے ملک ایمان فروش اور ضمیر فروش افراد کو خرید کر اس ملک پر اپنی اجارہ داری قائم کر چکی ہیں اور یہ سلسلہ ماضی سے آج تک جاری و ساری ہے۔ مارشل لاء کے بعد عوام کی منتخب کی گئی جمہوری حکومت کو راتوں رات غیر قانونی طریقے کو عدالتوں کے ذریعے قانون کی شکل دی جاتی ہے۔ آخر وہ کون سی اندرونی اور بیرونی قوتیں ہیں جو پاکستان

کو سیاسی طور پر مستحکم نہیں ہونے دیتیں۔

آزادی کے پچھتر سال گزرنے کے باوجود آج بھی ہم آزاد خارجہ پالیسی نہیں بنا سکے۔ اس کی بڑی وجہ ملک کی معیشت کو عیاش حکمرانوں اور اداروں کی جانب سے لوٹنا اور اپنے اثاثے بیرون ملک منتقل کروانا ہے۔ اگر یہ کہانی آنے والے دور میں بھی دہرائے گئی اور ملک کو محب وطن سیاست دان نہ ملے تو ملک کے وجود کو خطرہ ہو سکتا ہے۔

## سیاست دانوں اور مقتدر اداروں کے رویے

ادیب معاشرے کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اُس معاشرے کا فرد ہونے کی حیثیت سے وہ انھی تحریروں میں سیاسی اور سماجی حوالوں سے بحث و مباحثہ کو شامل کرتا ہے۔ سیاسی اتار چڑھاؤ اور سیاسی تبدیلیوں کے اثرات اور اُن سے پیدا شدہ صورت حال پر اپنی رائے کا اظہار اپنی تحریروں میں کرتا ہے۔ ادیب چونکہ باقی تمام افراد سے معاشرے میں ایک بلند رتبہ رکھتا ہے۔ معاشرے کے افراد اس کی تحریروں کو پڑھتے ہیں۔ ادیب کی تحریروں کے ذریعے موجودہ اور ماضی کے حالات و واقعات کے بارے میں جان کاری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس چیز کو مد نظر رکھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادیب کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ معاشرے میں ہونے والے سیاسی اور سماجی حالات کو بالکل درست انداز سے اپنی تحریروں میں شامل کرے اور سچائی اور ایمان داری کو پیش نظر رکھے۔ ایک ادیب جب اپنی تحریر میں کسی سیاسی یا سماجی واقعہ کا تذکرہ کرتا ہے تو اصل میں وہ اپنے سیاسی اور سماجی شعور کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ اُس کے کسی واقعے کے بارے میں اظہار ہو رہا ہوتا ہے ہمیں اُس ادیب کے سیاسی یا سماجی شعور کا پتا چلتا ہے۔ وہ لکھاری کس طرح اُن واقعات کے بارے میں لکھتا ہے اور اپنی رائے رکھتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ دور جدید کے سب سے نمایاں ادیب ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کی ایک کثیر تعداد رکھتے ہیں۔ جو انھیں پڑھتے ہیں اور اُن کی تحریروں کے ذریعے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے باقی تصانیف کی طرح کالم نگاری میں بھی کثیر سرمائے کا اضافہ کیا ہے اور ہنوز وہ مسلسل لکھ رہے ہیں۔ جس طرح مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالمی خدمات کے ذریعے پاکستانی سماج کے مختلف پہلوؤں کو بیان کیا اور سماج میں موجود برائیوں کی نشان دہی کی، وہیں مستنصر حسین تارڑ کے قلم نے پاکستانی سیاست میں موجود برائیوں کو بے نقاب بھی کیا۔ البتہ ان برائیوں کو بے نقاب کرنے کے انداز مختلف مقامات پر بدلتے رہے ہیں۔ کبھی کسی

برائی کا تذکرہ کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور کہیں کسی برائی پر کھل کر تنقید کرتے ہیں۔ اُن برائیوں کے ذمہ داروں کو وہ بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ اپنی رائے میں بھاری بھر کم الفاظ کا استعمال نہیں کرتے ہیں بلکہ عام اور سادہ الفاظ میں وہ بہت گہری بات کر جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کسی بھی سیاسی واقعہ کو گہرے طنز میں ڈبو کر لکھتے ہیں اور ذمہ داران کی طرف اشارہ کر کے بات کو کسی اور جانب موڑ دیتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے نہ صرف اپنے کالموں میں بلکہ اپنے ناولوں میں بھی سیاسی حالات و واقعات کو اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سفیر اعوان اپنے ایک مضمون "نگری نگری گھومنے والا" میں لکھتے ہیں:

"قبل از تقسیم کے ہندوستان اور بعد از آزادی کے پاکستان سے لیے گئے سیاسی حوالوں کے ساتھ ساتھ سماجی اور ثقافتی نوعیت کے کئی ایک موضوعات کو بھی تارڑ نے پیچیدہ کہانی کاری کی نیت کا حصہ بنادیا ہے۔" (۱۱)

ڈاکٹر سفیر اعوان اُن کے موضوعات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

"سیاسی سازشوں کی بدولت پاکستانی معاشرت اور ریاست کی بد حالی فوجی حکومتوں اور ملاؤں کا گٹھ جوڑ جلا وطنی اور پردیس میں اجنبیت کا احساس امریکی ذرائع ابلاغ کے بعد از ۱۱/۹ بازی کردار پر تنقید وغیرہ۔" (۱۲)

مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری میں بھی پاکستانی سیاست کے منفی پہلو کو موضوع بحث بنایا اور جہاں اُن کو پاکستانی سیاست دانوں کی جانب سے اٹھائے گئے کچھ مثبت اقدامات نظر آئے انھوں نے برملا اُن کی تعریف کی اور اُن کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے ہاں سیاسی نظام روز اول سے ہی تناؤ کا شکار رہا ہے۔ آئے روز حکومتوں کے بدلاؤ، ذاتی مفاد پر قومی مفاد قربان کر دینا، سیاسی وفاداریوں کو بدلنا، حکمرانوں کی عیاشیاں، ملکی خزانے کی لوٹ مار، سیاست دانوں کی عوام دشمن پالیسیاں، سرکاری املاک کا ذاتی استعمال، حکمرانوں کی نااہلی، لاقانونیت، سیاسی پارٹیوں کی باہمی چپقلش، عوام کی سیاست میں عدم دلچسپی، سیاست دانوں کے طریقے کار اور نسل در نسل اقتدار کا لالچ اور لاشوں پر سیاست کو تنقید کا نشانہ بنانا، جیسے عناصر سیاسی انتشار کا باعث بنتے ہیں۔

## سرکاری اداروں کی ناقص کارکردگی

ہمارے پاکستانی سرکاری اداروں میں بہت سے نااہل، بے ایمان اور ضمیر فروش لوگ موجود ہیں جن کی موجودگی میں یہ ادارے کم زور ہوتے جا رہے ہیں۔ ان افراد کی بے ایمانی اور ضمیر فروشی کی نذر نہ صرف ہمارے سرکاری ادارے ہو رہے ہیں بلکہ اُن کی غفلت کا شکار عام آدمی بھی ہو رہا ہے۔ پاکستان میں کوئی بھی ادارہ ایسا موجود نہیں ہے۔ جہاں بد عنوانی اور رشوت کے بغیر کوئی کام ہو۔ ان محکموں میں کام کرنے والے افراد کی تنخواہیں زیادہ ہوتی ہیں مگر یہ لوگ پھر بھی ان برائیوں سے باز نہیں آتے ہیں اور دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔

سرکاری اداروں میں دنوں کا کام ہفتوں اور ہفتوں کا کام مہینوں اور سالوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کام کی نوعیت بے شک وقت کم لے رہی ہو مگر ہمارے سرکاری ملازمین حکومتی دفتروں کے چکر لگوانے سے باز نہیں آتے بظاہر معمولی سے نظر آنے والا کام اُن کی سست روئی کا شکار ہو کر زیادہ وقت لینے لگتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "غم کے دروازے والدین کے جسموں پر ہی بند ہو جاتے ہیں" میں ہمارے اداروں کی اس سست روی اور غفلت کو نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے اپنے کالم میں ایک عام کہانی کے ذریعے سرکاری اداروں میں موجود افراد کی بد عنوانی کو سامنے لایا ہے۔ اس کالم میں لاہور کی ایک شہر کا تذکرہ ہے جس نہر کے کنارے پختہ کرنے کے لیے دوسری ریت کا استعمال نہ کیا گیا۔ اُس سرکاری ادارے کی جانب سے دیے جانے والے سرمائے کی مناسب دیکھ بھال نہ کی گئی تو ٹھیکیدار نے کوئی غیر معیاری طریقہ کار اپنائے ہوئے وہی ارد گرد سے کھود کر کنارے بنائے۔ جس کی وجہ سے وہاں گڑھے پڑ گئے اور آنے جانے والے لوگوں نے بھی اُس کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی جس کی وجہ سے دو چھوٹے بچے ڈوب گئے۔ سرکاری اداروں کی غفلت کی بدولت عام عوام کو بہت سے نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس غفلت کو نمایاں کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"ٹھیکیداروں نے اپنے پلے سے ریت خریدنے کے بجائے نہر کی ریت ہی چنائی کے لیے استعمال کی اس لیے وہاں پانیوں کے نیچے بڑے بڑے گڑھے تھے جو بچوں کو نظر نہ آتے اور وہ ڈوب گئے۔" (۱۳)

سرکاری ادارے اپنے فرائض میں غفلت برتنے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ اپنی غفلت اور غیر ذمہ دارانہ رویے کی وجہ سے یہ سرکاری ادارے اپنا کام وقت پر ایمان داری سے سرانجام نہیں دے پاتے ہیں جس کی وجہ سے

ضروری کام جس کو وقت پر ہو جانا چاہیے، ان افراد کی لاپرواہی کی وجہ سے تاخیر کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کا نقصان عوام برداشت کرتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے اس کالم میں ہمارے اداروں کی غفلت کو نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"میں نے سوچا سرکاری محکمہ ہے یقیناً بہت سارے دستخطوں اور بہت ساری درخواستوں کے بعد ہی ایسا ممکن ہو سکے گا۔" (۱۴)

سرکاری اداروں میں کام کی غرض سے جانے والے افراد کو ان رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ کام جس کو جلد ہو جانا چاہیے جس میں تاخیر کرنا کسی صورت ممکن نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں ان کے مراحل اتنی سست روی سے چل رہے ہوتے ہیں کہ وقت ختم ہو جاتا جس کی وجہ سے نقصانات اٹھائے پڑتے ہیں۔ ہمارے ہاں عوام کی فلاح و بہبود کے کام کرنے والے ادارے اس پروجیکٹ کے بعد سب بھول جاتے ہیں مثال کے طور پر برسات کے موسم میں نالوں کی صفائی بروقت مکمل نہ ہونے پر سیلاب کی کیفیت سے متاثر ہونے کا امکان زیادہ ہو جاتا ہے اور لوگوں کی کثیر تعداد ہمارے سرکاری اداروں کی غفلت کا شکار ہوتی ہے۔ اگر کوئی ترقیاتی منصوبے میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی تو ہمارے ادارے اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ خرابی کی صورت میں ان کو دوبارہ ٹھیک بھی کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر ملک میں عموماً ایسا ہوتا ہے کہ ادارے کمی کوتاہیوں کو دور کرتے ہیں اور نقصان کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے ہاں ادارے اپنے روایتی انداز کو اپنائے ہوئے ہیں، بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ہم خود کو ڈھالنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے ادارے وہی روایتی انداز کے مطابق چلتے ہیں اور بہتری کی جانب کوئی عملی کام نہیں کرتے۔ اس بات کو مستنصر حسین تارڑ اپنے اس کالم میں یوں بیان کرتے ہیں:

"کیا سبھی ملکوں کے سبھی والدین ہماری طرح اپنے بچوں کی واپسی تک گھبرائے ہوئے رہتے ہیں۔ وہاں بھی تو کاریں اور ویگنیں ہوتی ہیں مگر میرے خیال میں اتنی تیز رفتار اور اندھی نہیں ہوتیں اور خرابی تو صرف ہمارے ملک میں پائے جاتے ہیں اور وہاں نہیں بھی ہوتی ہیں مگر ان میں سے ریت نہیں کھودی جاتی۔" (۱۵)

وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے ادارے اپنی روش سے باز آئیں ان اداروں میں تعینات افسران بالا اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے ہوئے ایمان داری سے کام کریں اپنے کام کی طرف ہر وقت توجہ دیں اور اپنے ماتحت افراد سے

کام لیں اور اُن کی نگرانی کریں تاکہ عوام مزید مشکلات سے بچ سکے۔ ناگہانی آفات سے نمٹنے کے لیے بروقت اقدامات سے ہی ہم زیادہ نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ عوام کی فلاح و بہبود کے جاری منصوبوں کو بروقت مکمل کرنے اور بعد میں اُن میں ہونے والی خرابیوں کا وقت تدارک لازم ہے۔

## سیاست دانوں پر طنز:

پاکستانی سیاست میں شروع سے ہی اتار چڑھاؤ موجود رہا اور ۲۰۲۰ء تک بھی پاکستانی سیاست ہمیشہ کی طرح اتار چڑھاؤ کا شکار نظر آتی رہی۔ نااہل سیاست دانوں کی غلط پالیسیوں سے ملکی معیشت کبھی سنبھل نہ سکی۔ ملکی خزانے سے لوٹ مار کا سلسلہ آج تک جاری و ساری ہے۔ ملکی خزانے پر ہاتھ صاف کرنے والے سیاست دان اور جرنیل ملک سے باہر اپنے اثاثے جمع کر رہے ہیں۔ اُن کے رویوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کے نام پر بیرونی امداد لے کر آئی ایم ایف سے قرض لے کر انھوں نے اپنے اکاؤنٹ بھرے ہوئے ہیں۔ اقتدار کی کھینچ تانی میں پاکستانی سیاست دان ہمیشہ سے ہی مصروف عمل رہیں ہیں۔ نااہل سیاست دانوں نے جس بھی شعبہ میں قدم رکھا اُس اُس کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک پاکستان میں کسی شعبے نے کوئی خاطر خواہ ترقی نہیں کی بلکہ اپنی تنزلی کے منازل ہی عبور کرتا رہا۔ اداروں کی سرپرستی نااہل افراد کے ہاتھوں میں آتے ہی اداروں کا زوال شروع ہو گیا۔ نااہل سیاست دانوں کی پالیسیوں کا یہ ثمر ہے کہ پاکستان آج تک معیشت کے اعتبار سے مضبوط نہیں ہو رہا۔ ہر ادارہ تباہی کے دھانے پر پہنچ چکا ہے۔ ملکی معیشت کو چلانے کے لیے بیرونی امداد کے ہمیشہ سے ہی محتاج رہے ہیں۔ اور ملنے والی یہ بیرونی امداد ملکی معیشت پر کم اور سیاست دانوں اور جرنیلوں کی جیبوں میں زیادہ جاتی ہے۔ سیاست دانوں کی اس نااہلی کے باوجود بھی ہماری عوام اُن کی حمایت کرنے میں برابر مشغول ہے۔ نسل در نسل اقتدار کی منتقلی ملکی سیاست پر چھائے وہی پچاس سالہ چہرے ہی ہم نے اپنی کم عقلی سے اپنے پر مسلط کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے ہماری اس روش کو علامتی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اپنے ایک کالم "گدھے ہمارے بھائی ہیں" میں لکھتے ہیں:

"ہم اپنے گدھوں کو کچھ نہیں کہتے چاہے وہ نادہندہ ہی کیوں ناہوں۔ گدھوں سے محبت کی اس پالیسی کی وجہ سے ملک نے بے شمار مشکلات کا سامنا کیا ہے۔ گدھوں کی مرضی میں جو آتا ہے وہ کرتے ہیں۔ پچھلے پچاس برس سے ہم گدھوں کو ہی لفٹ کرواتے چلے آتے ہیں

جس کی وجہ سے ہمارا یہ حال ہوا ہے۔" (۱۶)

مستنصر حسین تارڑ کے نزدیک ہمارے مسائل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم محض گدھوں کو سپورٹ کرتے ہیں۔ پچھلے کتنے سالوں سے آزمائے ہوئے لوگوں کو ہم اس امید کے ساتھ منتخب کرتے ہیں کہ شاید اس بار وہ کچھ اچھا کر سکیں مگر ہماری امیدوں کے خلاف یہ لوگ ہمارے مسائل میں مزید اضافہ کر کے چلے جاتے ہیں اور اپنی نااہلی کی بدولت ملکی اداروں کو مزید نقصان پہنچاتے ہیں۔

ضلع صوابی میں ایک سکول میں گدھوں نے ڈیرہ ڈال لیا۔ اس بات کو علامت بنا کر مستنصر حسین تارڑ نے ان گدھوں کی جانب اشارہ کیا جو ایک عرصے سے ہمارے اداروں پر قبضہ کیے ہوئے ہیں اور ان کی ناکام پالیسیوں کی وجہ سے مسائل روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"ہمارے تمام مسائل ہماری گدھا پسندی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں ہم نے جان بوجھ کر گدھوں کو سر آنکھوں پر بٹھا رکھا ہے۔ ویسے تو ایک مدت سے مختلف اداروں سے ہمیں ڈھینچوں ڈھینچوں کی آوازیں آرہی تھیں مگر ہم نے ان پر کان نہیں دھرا اور اب پورا ملک اس غفلت کی سزا بھگت رہا ہے۔" (۱۷)

آزادی کے بعد ہمارا سیاسی نظام نااہل افراد کے ہاتھوں میں آیا جس کی وجہ سے ملک میں کبھی سیاسی اور سماجی استحکام کی صورت حال نظر نہیں آتی۔ ملکی اداروں میں موجود نااہل افراد کی من مانیوں ایسے میں ہمارے مسائل میں مزید اضافے کا سبب بنی اور مسلسل آج تک بن رہی ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان افراد کے چناؤ کے عقل مندی سے کام نہیں لیا اور ان کی ہر غلط پالیسی پر خاموشی اختیار کیے رکھی تھی ان لوگوں کا احتساب نہیں کیا جو ملک اور قوم دونوں کے لیے ہمیشہ سے نقصان کا باعث بن رہے تھے اور آج تک بن رہے ہیں۔ ہماری اس سیاسی ذہنی غلامی اور لاپرواہ رویے کی وجہ سے ان افراد کی موجودگی کی سزا ہمارے ملک اب تک کاٹ رہا ہے۔

## سیاست دانوں کی غیر قانونی سرگرمیاں

پاکستان میں لا قانونیت یا قانون شکن سرگرمیاں نہ صرف ہماری عوام کی طرف سے جاری ہیں بلکہ ہمارے سیاست دان جن کا کام ہی اس ملک میں قانون کی سرپرستی کا ہے۔ وہ قانون شکن کاموں میں مصروف عمل

نظر آتے ہیں۔ ایسی بہت سی غیر قانونی حرکات یا سرگرمیوں پر جب عدالت میں مقدمے بے نقاب ہوتے ہیں تو ہمارے حکمرانوں کے نام سامنے آتے ہیں مگر اُن پر کارروائی کرنے کی جرات کس میں ہو؟ ایسے بہت سے کیسز جن میں بااثر افراد کا نام سامنے آتا ہے اُن کو بہت جلد منظر عام سے ہٹایا جاتا ہے یا سرے سے ہی ایسے مقدمات عدالتوں میں آتے ہی دب جاتے ہیں۔ بااثر افراد اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے دباؤ عدالتوں پر بڑھاتے ہیں یا پھر اُن کے اپنے رشتہ دار عدالتوں میں اعلیٰ مقامات پر فائز ہوتے ہیں جن سے وہ اپنی مرضی کے فیصلے کروا سکتے ہیں اس لیے قانون ہمیشہ ایسے لوگوں کے لیے خاموش نظر آتا ہے۔

عدالت سے ثابت شدہ مجرم ہمارے معاشرے میں سرعام دنداناتے پھر رہے ہوتے ہیں۔ اُن کے ساتھ کوئی مجرموں والا سلوک نہیں کیا جاتا ہے۔ وہ لوگ عدالتوں سے وکٹری کا نشان بنا کر باہر آرہے ہوتے ہیں کہ عدالت کا بااثر افراد ہر کوئی زور نہیں چلتا اور قانون صرف اور صرف غریبوں اور کم زوروں کے لیے ہے۔ ہمارے سماج میں ہمارے سیاست دان اکثر کسی غیر قانونی سرگرمی کی پشت پناہی کر رہے ہوتے ہیں۔ اُس سرگرمی سے قانون کی بالادستی متاثر ہوتی ہی ہوتی ہے۔ ساتھ میں اُن کی حرکات کی وجہ سے ہمارے سماج کے افراد کو جانی و مالی دونوں صورتوں میں نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن اس نقصان کی جانب توجہ کم ہی دی جاتی ہے۔ کبھی کبھار تو مخالفین کی جانب سے ایسے معاملات اٹھائے جاتے ہیں مگر جلدی صلح و صفائی ہونے سے وہ مقدمات ایک دفعہ پھر پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور یوں بات دب جاتی ہے اور وہ غیر قانونی سرگرمیاں پہلے سے تھوڑی تبدیلی کے ساتھ ایک دفعہ پھر ہمارے سماج میں سرعام ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ ہمارے سیاسی افراد کی اس خامی کو اپنے ایک کالم میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لاہور میں ہونے والی بسنت کی رسم پر غیر قانونی طریقہ کار کو نمایاں کرتے ہیں۔ بسنت ہمارے برصغیر کا ایک تہوار تھا جو برصغیر کی تقسیم کے ساتھ پاکستان میں بھی آگیا۔ بسنت کی تقریبات تو بظاہر ہمارے سماج کے لیے پہلے نقصان نہیں رکھتی تھی یہ ہمارے لیے اس پریشان زدہ دور میں ایک تفریح مہیا کرنے والے والا event ہے۔ لوگ اس کو بہت خوشی سے مناتے ہیں۔ لاہور شہر تو خالص اس تقریب کے لیے بہت مشہور ہے مگر ہمارے ہاں ایسا ہوتا ہے کہ ہم جائز اور ناجائز کرنے میں فرق رکھنا تقریباً بھولتے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے ہماری جائز سومات بھی ہمارے لیے وبال جان بن جاتی ہیں۔ پہلے بسنت کے موقع پر جان لیوا ڈور کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا مگر اب زیادہ تر اس جان لیوا

ڈور کا استعمال سرعام کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمارے افراد کی قیمتی جانیں چلی جاتی ہیں اور اس جان لیوا ڈور کی فروخت میں ہماری قانونی ادارے ایکشن میں تھوڑے وقت کے لیے ضرور آتے ہیں اور بسنت پر پابندی لگائی جاتی ہے مگر اس ڈور کے مکمل خاتمے کے لیے کوئی مؤثر کارروائی نہیں کی جاتی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس قاتل ڈور اور دوسری غیر قانونی سرگرمیوں پر پابندی لگنی چاہیے مگر شاید وہ کرنا ہمارے اداروں کے بس میں نہیں کیونکہ بااثر شخصیات یہاں بھی قانون کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہیں۔ کچھ عرصہ سے اس خونی ڈور کے ساتھ بسنت پر ہوائی فائرنگ کا سلسلہ بھی زور پکڑتا جا رہا ہے مگر ہماری پولیس اور قانون نافذ کرنے والے ادارے برائے نام کارروائی کرتے ہیں۔ یہ اس کی جانب توجہ نہیں دیتے اس کی وجہ صرف ایک ہے کہ ان سب غیر قانونی کاروائیوں کے پیچھے کسی نہ کسی سیاسی شخصیت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بااثر شخصیات کی اس قانون شکنی کو مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "روم جل رہا ہے" میں بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"ہم کسی اور سے کیا شکایت کریں بسنت منانے والوں میں ایسے لیڈران کرام اور شخصیات ہیں جن کے منہ کی طرف ہم جیسے نالائق دیکھتے ہیں کہ اب ان کے منہ سے ملک و قوم کی فلاح کے نسخے گریں گے اور ہم انہیں پھولوں کی طرح سنبھال لیں۔" (۱۸)

اس کالم میں ایک اور جگہ تارڑ صاحب لکھتے ہیں:

"لاہور شہر کی آدھی چھتوں پر فائرنگ ہوتی رہی لیکن اُس روز پولیس کو روز ہمت نہ ہوئی کہ کچھ کر سکیں۔" (۱۹)

سوال یہ ہے کہ ہم اپنی رسوم و رواج میں غیر قانونی طریقوں کو شامل کریں اور وہ سرگرمیاں جو ہمارے سماج کے افراد کے لیے نقصان دہ ہو رہی ہوں اور کھلے عام قانون کے ناک کے نیچے سرانجام دی جا رہی ہوں۔ کیا صرف اُن کی وجہ سے ہم اپنا ہر تہوار چھوڑ دیں گے۔ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان سرگرمیوں کے پیچھے چھپے افراد تک قانون اپنا ہاتھ پہنچائے اور اُن کے خلاف کارروائی کرنے کی جرات پیدا کرے۔ ایسا کرنے سے ہمارا سماج ان سیاسی اور بااثر افراد کی غیر قانونی سرگرمیوں سے نجات حاصل کر لے گا۔ اس طرح بااثر اور سیاسی شخصیات قانون کے شکنجے میں آجائیں گی اور اُن کے خلاف بھی مؤثر کارروائی ہو سکے گی۔

## بیوروکریسی اور سیاست دانوں کی کرپشن

کسی بھی ریاست کی ترقی اور کامیابی کے لیے اس ملک کے سیاست دانوں اور وہاں کی بیوروکریسی کا فرض شناس اور ایماندار ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ بیوروکریسی کسی بھی ملک کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے میں ان کا کردار بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے بغیر حکومت کا چلنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جس ملک کی بیوروکریسی ایمان داری ہوتی ہے وہاں مسائل زیادہ نہیں ہوتے ہیں۔ پاکستان کے سیاست دان اور حکام بالا کرپٹ بیوروکریٹ کی نااہلی اور کرپشن کے باعث ملک میں سیاسی مسائل روز بروز شدت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ سیاست دان تو دن رات ملکی خزانہ کو لوٹ رہے ہیں۔ اس ساتھ میں ہمارے بیوروکریٹ بھی سیاست دانوں سے کم نہیں ہیں۔ جہاں ان کو اپنے مفاد نظر آنے لگتے ہیں یہ ملکی مفاد کو بھول جاتے ہیں۔ ان حکام بالا پر اربوں روپے کی کرپشن ثابت ہو چکی ہوتی ہے مگر ان پر کوئی قانونی کارروائی عمل میں نہیں آتی اور اگر آئے بھی تو کاغذی کارروائی سے آگے بات نہیں بڑھتی۔

ملکی خزانے سے ان کی عیاشیوں کو پورا کیا جاتا ہے۔ جس عوام کی خدمت کے لیے یہ لوگ آتے ہیں اس عوام کو اپنے دفتروں کے باہر گھنٹوں کھڑے رکھتے ہیں اور سالوں اپنے دفتروں کے چکر لگواتے ہیں مگر یہ لوگ عوامی ٹیکس سے کرپشن کرنے سے باز نہیں آتے ہیں۔ ان کے خاندان کو شاہانہ پروٹوکول دیا جاتا ہے اور اس پروٹوکول کا سارا خرچہ عوامی خزانے سے ادا کیا جاتا ہے۔ بہت سارے الاؤنسز ملنے کے بعد بھی کچھ لوگ بے ایمانی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور لوٹ مار کرتے ہیں اور اپنے اپنے بینک اکاؤنٹ بھرتے ہیں۔ پاکستانی اداروں کی تباہ حالی میں نااہل کرپٹ سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ کچھ بیوروکریٹس بھی شامل ہیں۔ جو ان اداروں کی بہتری کے لیے کام نہیں کرتے اور ملکی فنڈز سے اپنے پیٹ بھرتے ہیں۔ انھیں عوامی فلاح و بہبود کے لیے استعمال میں نہیں لاتے ہیں۔ اداروں کی بہتری کے لیے کام نہیں کی جاتے جس کی وجہ سے ادارے زوال پذیر ہو رہے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کرپٹ اور نااہل سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کو سخت تنقید کا نشانہ بنانے میں وہ ان کو وہ چوبے قرار دیتے ہیں جو اپنے ہی کھیتوں سے فصلوں کو کترتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے فصلیں تباہی اور بربادی کا شکار ہوتی ہیں اور قلت پیدا ہوتی ہے یہ کرپٹ لوگ بھی ان چوبیسوں کی مانند ہوتے ہیں جو دن رات قومی خزانے کو کترتے رہتے ہیں۔ اداروں میں اپنی کرپشن کی بدولت ان پر زوال جیسی صورت حال پیدا کرتے ہیں اور ملک اور عوام کو مشکلات میں

ڈالتے ہیں۔ تارڑ صاحب اپنے ایک کالم میں "الو بڑھاؤ چوہے مکاؤ مہم" میں علامتی انداز اپناتے ہوئے ان کا اہل اور کرپٹ لوگوں کو چوہے قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"پاکستان میں پیدا ہونے والی گندم اور دیگر اجناس کا ایک بڑا حصہ چوہیوں کے شکم میں چلا جاتا ہے ویسے ان انسانوں پر بھی ریسرچ کرنی چاہیے تھی جو دراصل چوہے ہیں اور ملک و قوم کی دولت کھاجاتے ہیں لیکن اس میں کچھ پردہ نشینوں کے نام بھی آتے ہیں۔" (۲۰)

اپنے کالم میں تارڑ صاحب ان چوہیوں کو مارنے کے لیے الو بڑھاؤ پر زور دے رہے ہیں کہ الو زیادہ تعداد میں ہو کر ان چوہیوں کا خاتمہ کر دیں تاکہ وہ چوہے جو دن رات اپنے کترنے کی عادت کی وجہ سے ملک اور قوم کو اپنی بے ایمانی اور ضمیر فرشی کی وجہ سے سخت نقصانات پہنچا رہے ہیں۔ ان کا تدارک ہو سکے۔ اس ضمن میں مستنصر حسین تارڑ مزید لکھتے ہیں:

"میں سمجھتا ہوں کہ اس مہم کا آغاز سرکاری طور پر ہونا چاہیے جیسے چین میں فصلوں کو بچانے کے لیے جڑیوں کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔۔۔ یہ الو فارغ اوقات میں کھیتوں کے چوہے نوش کریں گے اور دیکھتے دیکھتے چوہیوں کا خاتمہ ہو جائے گا ملک میں خوش حالی آجائے گی۔ البتہ میری اس تجویز میں الگ سقم ہے جب یہ چوہے ختم ہو جائیں گے تو الو کیا کریں گے؟ انہیں حکام بالا اور بیوروکریسی کی رفاقت میں رہنے کی عادت ہو جائے گی اور وہ ملکی معاملات میں معاون ثابت ہونے لگیں گے کہ شاید اس میں بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔" (۲۱)

ملک میں ایسے سیاست دان اور کرپٹ بیوروکریٹس جو دن رات اپنی کرپشن کی وجہ سے ملک و قوم کی تنزلی کا باعث بنتے ہیں ان کے خاتمے کے بعد ہی ملکی ترقی ممکن ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں ان افراد کی ضرورت پر زور دیا گیا جو الو کی طرح ملک و قوم کو نقصان پہنچانے والے ان چوہیوں کے خاتمے کا باعث بنے اور ملکی ترقی اور خوش حالی میں اہم کردار ادا کر سکیں اور جن کی ایمان داری اور محنت کی وجہ سے سیاست اور بیوروکریسی میں موجود خامیاں دور ہو سکیں۔ ملک کی ترقی کی راہ ہموار ہو سکے۔

## حکمرانوں کی نااہلی

پاکستانی سیاست میں کسی بھی دور میں استحکام دیکھنے کو نالا۔ اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہاں کے سیاست دان نااہل ہیں اور وہ سیاست کے بارے میں جان کاری نہیں رکھتے ہیں۔ پچھلے پچھتر سالوں سے ہم پر وہ حکمران مسلط رہیں گے جن کو اقتدار ورثے میں ملا ہے اور بد قسمتی سے یہ سلسلہ آج ۲۰۲۲ء تک بھی چل رہا ہے۔ دادا، بابا، باپ، بیٹا، بیٹی کی یہ سیاست پاکستان کو لے ڈوب رہی ہے۔ یہاں عام بندے کی نمائندگی کرنے والے افراد امیر طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ دس دس سالوں میں وزارتوں کے مزے لوٹنے والے وزیر اور ان کے مشیروں کی فوج عوامی مال کھا کر عوام کو نئے مسائل کا تحفہ دے کر کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں یا حزب اختلاف / اپوزیشن میں بیٹھ کر اقتدار بھی موجود حکومت کا جینا اور کام کرنا حرام کر دیتے ہیں۔ یک بعد دیگرے آنے والی حکومتیں ایک دوسرے کی ناکامیوں اور نااہلیوں کا رونا روتے ہوئے اپنی معیاد حکومت گزار دیتی ہیں اور اپنی حکومت کے خاتمے کے بعد اپوزیشن میں رہ کر اقتدار میں موجود حکومت پر تنقید کرتی ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "آئٹیاں ہی آئٹیاں" میں طنزیہ انداز میں پاکستانی سیاست میں موجود افراد کی نااہلی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ طنزیہ انداز کے ساتھ ساتھ تارڑ صاحب نے مزاح کی چاشنی کو بھی برقرار رکھا۔ کالم میں ان خواتین کا ذکر بھی کیا جو عموماً گاڑی لے کر روڈ پر آ جاتی ہیں مگر وہ ڈرائیونگ اور ڈرائیونگ کے اصولوں سے ناواقف ہوتی ہیں۔ ان کی روڈ پر موجودگی دوسرے لوگوں کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہوتی ہے۔ بالکل ان آئٹیوں کی طرح ہمارے بھی کچھ سیاست دان ملکی تاریخ میں ایسے موجود رہے ہیں اور آج تک ان کی موجودگی ہے جو سیاست کے اصولوں سے نابلد ہیں مگر وہ پھر بھی سیاست میں موجود ہیں اور ان آئٹیوں کی طرح مسلسل دوسروں کے لیے خطرے کی علامت بنے رہے ہیں۔ تارڑ پاکستانی سیاست میں اس نااہلیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آئٹیوں کی سب سے زیادہ تعداد سیاست دانوں میں پائی جاتی ہے کیونکہ اس محکمے میں

گنجائش بہت ہے۔" (۲۲)

سیاست دانوں کی اس نااہلی کی بنیاد پر پاکستانی سیاسی نظام مضبوط ہونے کے بجائے روز بروز کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستانی سیاست لڑائی جھگڑے فسادات ذاتی مفادات پر مبنی سیاست مذہبی جماعتوں میں شکم پرست افراد کی

موجودگی وزیروں اور مشیروں کی فوج ملکی خزانے سے لوٹ مار الزامات کے سوا کچھ نہیں ہے اور ایسی سیاسی رویے کی وجہ سے پوری دنیا میں ہم محض ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ پاکستانی وزیروں کی قابلیت کی صورت حال یہ ہے کہ پانچ پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اُن کی تعلیمی اسناد جعلی ثابت ہوتی ہیں مگر پھر بھی وہ وزیر رہتے ہیں اور ایک عرصہ تک اُن کو انتظامی ذمہ داری سونپی ہوتی جو انھوں نے ادارے کی تباہی و بربادی کی صورت میں دنیا کے سامنے رکھی ہوتی ہے۔ یہاں سیاسی امور پر توجہ کم اور اپنے مفادات پر زیادہ دی جاتی ہے جس کی وجہ سے سیاسی حالات مزید خراب ہی ہوتے ہیں۔

### سیاسی وفاداریاں بدلنا

پاکستانی سیاست میں روایتی اور ابدی اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ سیاسی لیڈران کی جانب سے سیاسی وفاداریوں کی تبدیلی بھی جاری و ساری ہے۔ پاکستانی سیاست کو سب سے زیادہ متاثر حکمرانوں کی سیاسی وفاداریوں نے کیا ہے۔ کسی بھی سیاسی جماعت میں شمولیت کے بعد یہ موسمی سیاسی بٹیرے ملک و قوم کی ترقی و بہبود کے کھوکھلے نعرے لگاتے ہیں اور اگر حکومت کی معیاد پوری ہو جائے تو یہ لوگ حکومت میں رہ کر فلاحی کاموں کی جانب توجہ کم اور اپنے سیاسی اور ذاتی مفادات کی فکر زیادہ کرتے ہیں۔ پورے پانچ سال جس سیاسی جماعت کے اندر رہ کر یہ برائے نام کام کرتے ہیں۔ اگلے الیکشن میں کسی اور پارٹی کا جھکاؤ دیکھ کر یہ لوگ ایک دم اپنا سیاسی موقف بدل کر دوسری سیاسی جماعت میں شامل ہو جاتے ہیں اور یہاں رہ کر بھی محض اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ اپنے مقاصد پورا کرتے ہیں اور یوں اپنے اس عمل سے چڑھتے سورج کی پوجا والے محاورے کو سچ ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ ملکی حالات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہیں جہاں ان کو اپنا مفاد نظر آتا ہے وہاں ان کا گھیرا ہوتا ہے۔ کل تک یہ لوگ جس سیاسی جماعت کو گالیوں سے نوازا رہے ہوتے ہیں۔ اُس سیاسی جماعت کے قائدین کو سڑکوں پر گھسیٹنے کی بات کرتے ہیں اچانک مفاد بدلنے پر انھی لوگوں سے ہی گلے مل رہے ہوتے ہیں۔ ملکی سیاسی مفاد کی آڑ میں اپنی اپنی وزارتوں کے مزے لوٹنے کی فکر میں ہوتے ہیں۔ جہاں اپنے مفادات نظر آتے ہیں وہ بدلنے میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے ہیں۔ صدر علی خان اپنے ایک بلاگ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یہ کام ماضی میں تو اپنے عظیم مقصد کے لیے تھا مگر اب محض اپنے ذاتی فائدے کی خاطر

وفاداریاں تبدیل کرنے کی روایت کو آگے بڑھایا گیا ہے۔" (۲۱)

سیاسی وفاداریوں کی یہ روایت پرانی ہے۔ ماضی میں شاید کسی نیک مقصد کے لیے وفاداریاں بدلتی ہو جس سے ملک و قوم کی فلاح و بہتری مقصود ہو مگر اب ایسا ہمارے سیاسی نظام میں نہیں پایا جاتا۔ محض اپنے مفاد کو سامنے رکھا جاتا ہے اور اس بات کا عملی ثبوت ہمارے وزیر اور غیرہ دے چکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے سیاست دانوں کی ان وفاداریوں پر خوب تنقید کی ہے۔ وہ اپنے ایک کالم "دھند میں بھیڑ بکرے جاسکتے ہیں" میں مکالماتی انداز اپنائے ہوئے سیاست دانوں کی ان حرکات کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ وہ علامتی انداز میں ایک کردار خلیفہ خلفشاری کی زبان سے لکھواتے ہیں:

"تم نے کبھی فصلی بیڑوں کے بارے میں سنا ہے؟ میں ان کی بات کر رہا ہوں یہ بیڑ موسم کی تخصیص کیے بغیر جہاں کوئی فصل دیکھتے ہیں اسے چگنے کے لیے آجاتے ہیں۔" ان دنوں بھلا کون سی فصل خلیفہ؟ فصل اقتدار جو پک چکی ہے۔ لیکن وفاداری بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔۔۔ نہیں ہوتی صرف وزارتیں، سفارتیں ہوتی ہیں۔ اب بھلا کون اگلے حصہ الیکشن تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے جبکہ ہاتھ کے سامنے گنگا بہہ رہی ہو تو کیونکہ اس کا فائدہ اٹھایا ہے۔" (۲۴)

ایسی بہتی گنگا میں وقت اور ضرورت کے حساب سے ہمارا سیاسی قائدین، وزیر، ہاتھ دھونے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں اور ان کی شرط بس اتنی ہوتی کہ گنگا میں بہنے والا پانی اُن کے مفادات کا پانی ہو۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "یہ خون کی مہک ہے یالبار کی خوشبو" میں ان سیاسی فصلی بیڑوں کے دوغلے اور منافقانہ رویے کے بارے میں لکھتے ہیں جس میں وہ ایک قانون وزیر جو ہر عہد میں سیاسی وزارت کے مزے لوٹتی رہی اس کے متعلق وہ اپنے کالم میں لکھتے ہیں۔

"یرقان اس خاتون کے ہر عہد میں حکومت کے مزے لوٹے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ وہ بی بی کا نام سن کر طیش میں آجاتی تھیں اسے کو سننے دے دے کر ہانپ جاتی تھی۔ پانی کا ایک گھونٹ بھر کر پھر سے شروع ہو جاتی تھی اور آج وہ پھر سے پارٹی کے ماتھے کا جھومر ہو گئی اور بی بی بھی اُن پر صدقے واری جا رہی ہیں۔ وزارتیں اور سفارتیں یونہی ایک ہی مقام پر ڈٹے رہنے سے نہیں ملتیں۔ ہمیشہ لڑھکتے رہنے سے ملتی ہیں۔" (۲۵)

سیاسی وفاداریوں میں آج بھی بہتری دکھائی نہیں دیتی۔ ان سیاسی لوگوں نے پارٹیاں بدل کر جو کارنامے سرانجام دیے وہ سب کے سامنے ہیں۔ ان وزرا کے علاوہ بہت سے ایسے نام ہیں جنہوں نے بہتی گنگا میں ہاتھ دھویا ہے جیسے ہی ان کی وزارت کو خطرہ ہوتا ہے وہ اُس سیاسی جماعت کو بدل کر ملکی سیاست میں ابھرنے والی کسی دوسری سیاسی جماعت میں پناہ لے لیتے ہیں۔ اس کی بدولت اُن کو کوئی عمدہ وزارت کی پیشکش ہوتی ہے جو انہوں نے قبول کرنی ہوتی ہے یا جو ان کا مقصد ہوتا ہے۔ پاکستان میں یہی سیاسی ہیر پھیر کبھی سیاسی طور پر پاکستان کو مستحکم نہیں ہونے دیتی ہے۔ جس کی وجہ سے اندرونی اور بیرونی قوتیں اور دشمن عناصر اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ قانون میں بھی ان سیاسی رہنماؤں کی ہیر پھیری کو غلط نہیں جانا جاتا ہے جو سراسر نقصان ہے۔ حالانکہ دوسرے ممالک میں خصوصاً برطانیہ میں سیاسی وفاداریاں بدلنے پر کسی بھی شخص کا سیاسی کیریئر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے سماج میں اس سیاسی نظام کو ختم کرنے کے لیے کوئی قانون موجود نہیں۔

وزرا آئے روز اپنے مفادات کے پیش نظر اپنی اپنی جماعتوں کو خیر آباد کہہ رہے ہیں۔ دلچسپ امر یہ کہ جس سیاسی جماعت کو یہ اقتدار میں رہ کر گالیوں سے نوازتے ہیں، بعد میں اسی کے گن گارہے ہوتے ہیں۔ بد قسمتی سے یہاں ہمارے ملکی مفادات یا ملک کے سنگین حالات سے ان سیاسی لوگوں کو کوئی خاصی دلچسپی نہیں ہوتی ہے جس کی بدولت وقتِ آزادی سے ملکی سیاسی صورت حال میں بہتری آنے کی بجائے حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔ زیادہ تر سیاسی افراد وزراء کے بیرون ملک اکاؤنٹس عوامی خزانے سے لوٹے گئے پیسوں سے بھرپور ہیں۔ جائیدادیں کاروبار وہ باہر بناتے ہیں۔ نقصان صرف یہاں کے عوام کا ہوتا ہے جن کو وہ ہر الیکشن میں بے وقوف بنانے کے لیے پھر میدان میں آجاتے ہیں۔

## ریاستی وسائل کا بے جا استعمال

پاکستان کے سیاسی نظام میں حکمرانوں کو شاہانہ پروٹوکول دینا ایک لازم بات ہے۔ ایک وہ وزیر جو پورا پانچ سال اقتدار میں رہتا ہے۔ عوام فلاح و بہبود اور ملکی ترقی کے لیے جس نے محض باتوں کی حد تک دعوے کیے ہوں مگر عملاً اُس نے کچھ ناکیا ہو تو جب باہر نکلتا ہے تو اُس کے ساتھ ایسبیلینس درجنوں کے حساب سے گاڑیاں، موٹر سائیکل سوار، سیکورٹی پولیس، ٹریفک پولیس کی گاڑیاں جہاں سے ان وزیروں کو گزرنا ہو وہاں بے چاری عوام کا داخلہ یا تو مکمل طور پر بند کر دیا جاتا ہے یا ان کو گزارے کے کے سلسلے کو مکمل ہونے کے لیے عوام کو چار چار گھنٹے

سڑکوں پر انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس دوران کوئی مریض ایسبولینس میں تڑپ تڑپ کر جان دیتا ہے تو بے شک مرتا رہے حکمرانوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُن کا ہر صورت میں پروٹوکول مکمل ہونا چاہیے۔

ایک وہ وزیر جو محض دعوؤں کی حد تک کام کریں جس کے موجود ہونے سے وہ ادارے مکمل تباہ و برباد ہو جاتے جسکی موجودگی میں کوئی فلاحی کام نہیں کیا جائے بھلا اُس کی جان کو کیسا خطرہ ہو سکتا ہے۔ اُس کو اتنی سخت سیکورٹی دینے کا جواز کیا ہے کسی نے اُس کو کیا کہنا ہے حکمرانوں کے یہ شاہانہ پروٹوکول کم زور عوام اپنے ٹیکس کی صورت میں برداشت کرتے ہیں۔ وہی عوام جن کی خدمتوں کے جھوٹے خلف لے کر یہ اقتدار میں آتے ہیں پھر اُسی عوام میں چلنے سے اُن کو کیا خطرہ درپیش ہو سکتا ہے۔

دنیا کے سیاسی نقشے پر عام طور پر یہ چیز دیکھنے کو ملتی ہے کہ کسی بھی ملک کا وزیر اعظم عوامی ٹرانسپورٹ کا استعمال کرتے ہیں اور عوام میں گھل مل جاتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ ایک گاڑی کا استعمال کرتا ہے۔ عوامی مسائل کو جانتا ہے۔ اُن کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ منتخب ہونے کے بعد بھی عوام میں نظر آتے ہیں۔ مغربی ممالک کی معیشت مضبوط ہونے کے باوجود اکثر وہاں کے صاحب اقتدار شخص کو عام حالت میں دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ اُن کی معیشت مضبوط ہوتی ہے اگر وہ شاہانہ پروٹوکول رکھنا چاہیں تو رکھ سکتے ہیں مگر جیسا ہمارے ہاں ہوتا ہے وہاں کم دکھائی دیتا ہے۔ مظہر علی خان لاشاری نوائے وقت میں اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں۔

"ہمارے حکمران جو انہی اقتدار کے ایوان میں داخل ہوتے ہیں تو بھرپور پروٹوکول کو اپنی زندگی کا اہم جزو بنا لیتے ہیں۔" (۲۶)

ہمارے پاکستان میں اگر کوئی بیرون ملک کا وزیر اعظم یا وزیر تشریف لائے تو ہمارے حکمران اُس کی خوشامد میں اس کو شاندار پروٹوکول فراہم کریں گے جتنا پروٹوکول اس کو ہمارے ہاں دیا جائے گا اتنا اُس شخص کو اپنے ملک میں کبھی نصیب نہیں ہوا ہو گا۔ جب بھی کسی ملک کا حکمران پاکستان تشریف لاتا ہے تو دارالخلافہ کو سجاد یا جاتا ہے اور یہ فرق محض اسی جگہ پر دیکھنے کو ملتا ہے، جہاں سے اس حکمران نے گزرنا ہوتا ہے۔ باقی اگر آگے پیچھے کی بات کی جائے تو وہاں معمول کے مطابق حالات ہوں گے۔ اپنے ملک میں ہمارے وزیروں اور مشیروں کے لیے گاڑیوں کے دروازے کھولنے کے لیے بھی ایک ملازم ہوتا ہے جس کی تنخواہ عوام ادا کرتی ہے یہاں یہ وزیر

مشیر اپنی گاڑی کا دروازہ بھی خود سے نہیں کھول سکتے حالانکہ کوئی اور حکمران باہر سے تشریف لاتے تو یہ لوگ ان کے لیے دروازے خود کھول رہے ہوتے ہیں۔ خوشامدی کی انتہا اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ ان کی چھتیاں تک خود پکڑ لاتے ہیں مگر اپنے ہی ملک میں ان کے لیے یہ کام کرنے کے لیے ملازم رکھے جاتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے ہماری سیاست کی اس کمزوری کو اپنے ایک کالم "توجو ناواقف آداب شہنشاہی تھی" میں سخت طنزیہ لہجہ اپناتے ہوئے نمایاں کیا۔ انھوں نے اپنے کالم میں ملکہ برطانیہ کے پاکستان آنے کے واقعات لکھے کہ کس طرح ملکہ کی آمد کی خبر سن کر یہاں ترقیاتی کام زور و شور سے جاری ہوئے ہیں۔ جیسے اصل مالک ان کاموں کی جانچ پڑتال کے لیے تشریف لا رہے ہوں۔ ان کے پروٹوکول کے لیے ہزاروں افراد کو مصیبت میں ڈالا جاتا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں جو باہر سے تشریف لانے والے حکمران کو جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ کروڑوں روپے کے دیے جانے والے اس پروٹوکول کا دورانیہ بظاہر محدود ہوتا ہے مگر اس پر جو اخراجات ہوتے ہیں وہ عوام سے پورے کرنے ہوتے ہیں۔ ملکی خزانہ خالی ہو جانے پر واویلا مچانے والے یہ حکمران اپنی نادانیوں اور بے وقوفیوں کی وجہ سے معیشت کے کم زور ہونے کا شور کرتے ہیں اور بیرونی قرضہ کے لیے مختلف ممالک کی منتیں کی جاتی ہیں اس کے متعلق مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں۔

"دیکھو خلیفہ وہ بنیالوگ ہیں پیسے نہیں خرچے ہم شاہ خرچ لوگ ہیں اور شاہوں پر خرچتے

ہیں اور بعد میں آئی۔ ایم۔ ایف کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔" (۲۷)

ان شاہ خرچیوں کے سبب ہمیشہ سے ہی پاکستان کی معیشت خراب صورت حال کا شکار رہی اور کسی بھی دور حکومت میں معیشت مکمل طور پر ناسنبھل سکی۔ پھر قرضہ جات کے لیے ہمیں اپنی ملکی مفادات کا سودا بھی کرنا پڑتا ہے لیکن ہمارے حکمران طبقے کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کل کو اگر خدا نخواستہ پاکستان پر کوئی آنچ آ بھی جائے تو ان حکمرانوں نے ہمیشہ کی طرح باہر ممالک کی جانب رخ کر لینا ہے جہاں ہماری عوامی دولت سے انھوں نے اپنے ذاتی کاروبار کا آغاز کیا ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح قربانی کا بکرا عوام کو ہی بنایا جاتا ہے۔ اپنے ملک میں کروڑوں کا پروٹوکول لینے والے یہ حکمران جب اپنے اصل مستقبل کے ٹھکانے یعنی باہر ممالک جاتے ہیں تو یہ وہاں عام عوام کے ساتھ عام قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہیں وہاں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ پاکستان کا وزیر اعظم ہے، وزیر خارجہ ہے یا اس کے پاس کوئی وزارت ہے اور نا ہی ان کو وہاں پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ جب ہمارے ہاں

سے وزیراعظم یا کوئی بھی وزیر باہر ممالک اپنی پوری کابینہ کی فوج لے کر جاتا تو بیرون ملک ان کو اتنا پروٹوکول نہیں دیا جاتا جس کے عادی وہ اپنے ملک میں ہوتے ہیں۔ عام لوگوں کو ان کی آمد سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور ان کو ہماری طرح سڑکوں پر چار چار گھنٹے شاہوں کے گزرنے کا انتظار نہیں کروایا جاتا اور نا ہی ان کی عوام ایسولینس میں تڑپ تڑپ کر اپنی جان کی بازی ہارتی ہے۔ اس کے متعلق مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"یاریہ پروٹوکول ہوتا ہے۔ میں نے پھر کہا یہ پروٹوکول ہمارے ہاں ہی کیوں ہوتا ہے۔ انگلستان میں ہمارے صدر اور وزیراعظم جاتے رہتے ہیں۔ وہاں لندن میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ کون آیا اور کون گیا۔" (۲۸)

پروٹوکول سے ملکی خزانے پر پڑنے والے اس بوجھ کو عوام اپنے ٹیکسوں کے ذریعے پورا کرتی ہے۔ ہمارے اندر شعور کی کمی ہے جس کی وجہ سے یہاں ان شاہ خرچیوں کا احتساب نہیں ہوتا ہے ورنہ ہماری مشکلات کسی حد تک ضرور کم ہو سکتی ہیں۔ ان شاہانہ پروٹوکول اور ناجائز اخراجات کو اگر کم کیا جائے تو کسی حد تک پاکستانی معاشرے کے سیاسی و سماجی مشکلات کا حل ممکن ہے۔

## سیاسی جماعتوں کی باہمی چپقلش اور عوام کی خاموشی

ہمارے ہاں سیاسی جماعتوں کی لڑائیاں، ایک دوسرے پر سنگین الزامات، اقتدار کی کھینچا تانی آج بھی جاری ہے۔ اپوزیشن اور صاحب اقتدار جماعت کے افراد میں لڑائیاں جاری رہتی ہے۔ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتیں جو ایک عرصہ تک اقتدار میں رہی ہیں ایک دوسرے کو الزام تراشی اور اخلاقی حدود کی پامالی سرعام کرتے ہیں۔ ایک پارٹی جب اقتدار میں آتی تو پچھلی حکومت کی نااہلی کا رونا روتی اور چلی جاتی ہے۔ ان کے بعد آنے والی پارٹی کا بھی یہی وطیرہ رہتا ہے۔ یہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو کبھی آزادی کے ساتھ کام نہیں کرنے دیتی ہیں۔ ایک دوسرے کے جاری کے گئے عوام کے لیے فلاحی منصوبہ ایک دوسرے دشمنی میں روک دیتے ہیں۔

ان سیاسی جماعتوں کی لڑائیوں نے بہت سے سیاسی مسائل کو جنم دیا ہے۔ یہ ایک دوسرے کی حکومت کو برداشت نہیں کر سکتی اور نہ ایک دوسرے کی ترقی کو دیکھ سکتی ہیں۔ یہ سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کو عوام میں مقبول نہیں ہونے دیتیں۔ اس لیے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے طرح طرح کے الزامات لگاتی ہیں۔ پاکستانی سیاست میں ملک کی سیاسی جماعتیں حکومت وقت کو ہٹانے کے لیے طرح طرح کے حربے استعمال کرتی

ہیں۔ حکومت کی ناکامیوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے جو کہ ایک جمہوری مثبت عمل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ منفی بیانات کا سلسلہ بھی ان سیاسی جلسوں کا حصہ بن جاتا ہے۔ غیر اخلاقی اور غیر جمہوری طریقے سے ایک دوسرے کو فتح کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ سیاسی نمائندوں کی باہمی چپقلش سے ملک مزید سیاسی عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے اس اقتدار کی جنگ میں ملک میں حالات مزید خرابی کی جانب جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ سیاسی جماعتوں کے اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سیاسی پارٹیوں کی منافرت اتنے عروج پر ہے کہ وہ یا تو برداشت سکتی ہیں کہ ہندوستان پاکستان پر قبضہ کر لے لیکن یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ مخالف پارٹی برسر اقتدار آجائے۔ ایک الیکشن کے دوران حکومت میں ایک بہت بلند عہدے پر فائز ایک عزیز کے ساتھ سیاسی صورت حال کے بارے میں تھوڑی سی بحث ہوتی تو انھوں نے باقاعدہ کلمہ طیبہ پڑھ کر کہا کہ بے شک سکھ آجائیں لیکن پیپلز پارٹی کو نہیں آنا چاہیے۔" (۲۹)

سیاسی جماعتوں کے انھی رویوں کی وجہ سے ملک دشمنی عناصر کی تخریبی کارروائیاں تیز ہو جاتی ہیں جو ملک کی جڑوں کو کھوکھلا کرتی ہیں۔ سیاسی جماعتوں کے ان رویوں پر عوام بھی گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یہ جماعتیں اپنے اپنے اقتدار کی جنگ میں عوام میں پھوٹ ڈلواتے اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت پیدا کرتے ہیں۔ حقائق کیا ہوتے ہیں عوام کو ان حقائق سے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ سیاسی جماعتوں کے انھیں رویوں کو نیر سرحدی "روزنامہ ایکسپریس" میں اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"دکھ دراصل اس بات کا ہے کہ پاکستان میں ایسے منفی اور معاندانہ رویے پروان چڑھتے رہے ہیں کہ ایک کا اقتدار ختم ہوتا ہے تو دوسرا اقتدار میں آنے والا سابق حکمرانوں میں ایسے کیڑے نکالتا ہے کہ نادان عوام ان کی باتوں کو سچ سمجھ لیتے ہیں۔" (۳۰)

عوام کی سیاسی تقسیم معاشرے میں بد امنی کو فروغ دے رہی ہے۔ مختلف قسم کے گروہ جنم لیتے ہیں۔ اپنی اپنی سیاسی جماعت سے وفاداری اس قدر نبھائی جاتی ہے کہ کسی دوسرے کی سچی بات بھی جھوٹ پر مبنی لگتی ہے اور اپنے اپنے لیڈران کرام کی غلط اور جھوٹ پر مبنی باتوں کو ہماری عوام نے سچ مان لینا ہوتا ہے۔ اس سیاسی چپقلش میں عوام خاموشی سے تماشہ دیکھتی رہتی ہے۔ محض ذہنی غلام بن کر صحیح اور غلط میں فرق نہیں کیا جاتا۔ عوام حق اور سچ

کاساتھ دینے کو تیار نہیں ہے۔ کتنا بھی غلط کیوں نہ ہو جائے عوام نے ان حکمرانوں کا احتساب نہیں کرنا ہوتا۔ عوام کی اس خاموشی نے ہمارے حکمرانوں کو مضبوط بنایا ہے۔ انھیں اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ وہ عوام پر جتنا مرضی بوجھ ڈالیں عوام اس کو برداشت کر لیں گے۔ وہ کبھی ان کا احتساب نہیں کریں گے۔

عوام میں شعور کو بیدار نہیں ہونے دیا جاتا ہے۔ حکمرانوں کی غلطیوں کی سزا ہر صورت عوام کو ہی بھگتنا ہوتی ہے۔ پٹرول جتنا مرضی مہنگا کر لو عوام نے احتجاج کے طور پر کبھی اپنی گاڑیاں نہیں چھوڑتی ہیں۔ بلکہ پٹرول پمپ پر لمبی قطاریں بنا کر یہ ثابت کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم پر جتنا مرضی ظلم کر لیا جائے ہم نے اپنی خاموشی نہیں توڑنی ہے۔ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کے باعث عوام کی زندگی اجیرن بن چکی ہوتی ہے مگر عوام میں برداشت اس حد تک ہے کہ احتجاج نہیں کرنا اور نہ ہی اُن اشیاء کے خلاف بائیکاٹ کرنا ہے بلکہ مہنگے داموں وہ اشیاء ضرور خریدنی ہیں۔ سیاست دانوں کی ان لڑائیوں میں کوئی بھی مشکل وقت پاکستان پر آیا۔ قربانی عوام سے طلب کی گئی۔ مہنگائی ہو رہی ہے یا اشیاء کی کمی ہو رہی ہے۔ حکمرانوں کی جانب سے عوام کو گرانقدر مشوروں سے نوازا جا رہا ہے کہ ان اشیاء کے استعمال میں کمی ہو رہی ہے، ان کا استعمال ختم کر دیا جائے۔ حکمران، جرنیل اور بیوروکریٹ یہ ہر گز نہیں کہتے ہیں کہ ہم اپنے شاہانہ مزاج کو ترک کر کے ایک غریب اور قرضہ میں ڈوبے ہوئے ملک کے حکمرانوں کی طرح رہیں۔ اپنے اخراجات کم کر دیں، سادگی اختیار کریں۔

ملک پر مشکل وقت جب بھی آئے ہمیشہ عوام سے قربانی کی طلب ہوتی ہے۔ مشکل وقت میں اور الیکشن کے وقت میں عوام کی پکار ہوتی ہے۔ ملک پر نازک وقت چل رہا ہے۔ عوام صبر سے کام لے۔ ملک کو فلاں مسئلہ درپیش ہے ڈیم بنانے کے لیے پیسے دیں۔ ہر سال اربوں کے دیے گئے ٹیکس عوام کس لیے دیتی ہے اور اُن ٹیکس سے بیرون ملک اپنے اکاؤنٹس بھرنے اور جائیدادیں خریدنے اور کچھ اداروں کو فائدہ پہنچانے کے علاوہ اور کیا کیا جاتا ہے، اس بات کا احتساب آج تک ہو نہیں سکا جس کی وجہ عوامی مسائل میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے علامتی انداز اپناتے ہوئے عوام کو خرگوش کہا ہے۔ جس طرح خرگوش شریف اور چپ چاپ سا ہوتا ہے بالکل عوام بھی ایسی ہی ہے وہ اپنے ایک کالم "ہم خرگوش ہی اس ملک کے لیے گریہ کرتے ہیں" میں سیاسی پارٹیوں کی باہمی چپقلش اور اقتدار کی کھینچ تانی اور مفاد پرستی کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"ہم جو بے چارہ خرگوش ہیں ایک جانب بیٹھے بے بسی سے یہ تماشا دیکھتے تھے اور خون کے

آنسو روتے تھے۔۔۔ ہمارا کوئی اختیار نہیں تھا جب مشرقی پاکستان الگ ہوا تب بھی ہمارے ساتھ یہی ہوا تھا۔ ہم بے بسی سے دیکھتے رہے تھے۔ ہم نے قائد اعظم کا آدھا احسان ۱۹۷۱ء میں اتار دیا تھا اور بقیہ نصف احسان اتارنے کی حتی المقدور کوشش کی۔" (۳۱)

عوام کی نفسیات کو مکمل طور پر جانتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ اپنے کالم "ہم خرگوش ہی اس ملک کے لیے گریہ کرتے ہیں" لکھتے ہیں:

"ہم چونکہ خرگوش ہیں اس لیے جو کوئی بھی آتا ہے۔ ہمارے کان کھینچتا ہے کہ اوئے خرگوشو! ملک کے لیے قربانی دو، قرض اتارو، پیٹ پر پتھر باندھ لو اور جان قربان کر دو لیکن خبردار ہماری پجاریا مر سیڈیز کی جانب مت دیکھو اور اس کروڑوں ڈالر کے جیٹ ہوائی جہاز کو بھی مت دیکھو جو پنجاب کے ایک سابقہ چیف منسٹر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے درآمد کیا تھا اور جس کی اندرونی آرائش کے لیے چھ کروڑ روپے خرچ کیے گئے تھے۔" (۳۲)

عوام کے ٹیکسوں سے حکمران طبقے کی شاہ خرچیاں روز کا معمول ہے۔ کبھی مہنگائی کا بہانہ کر کے اقتدار میں آتے ساتھ ہی وزیر اعظم ہاؤس کا سونمگ پول بیس کروڑ میں دوبارہ سے ٹھیک ہوتا ہے تو کبھی ملک کے ممتاز ترین صحافی عوامی پیسوں پر اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت کی حمایت کے نتیجے پر دعوتیں اڑاتے ہیں۔ خیر ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے ہم تو خرگوش ہیں۔ تارڑ صاحب اسی کالم میں عوامی رویے پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہم تو خرگوش ہیں ہم تو نہیں پوچھ سکتے۔ ایک خرگوش کو بے شک دو وقت کی گاجریں میسر نہ ہوں لیکن گھوڑے تو چاکلیٹ کھائیں گے۔" (۳۳)

عوام کو درپیش مشکلات سے بے خبر یہ سیاست دان اپنی عیاشیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ قومی خزانہ بے شک خالی ہو مگر سیاست دانوں نے اپنی شاہ خرچیاں کم نہیں کرنی ہیں۔ عوام پر ٹیکسز کا مزید بوجھ ڈالنا ہے۔ لیکن قابل افسوس امر یہ ہے کہ عوام کی طرف سے مسلسل خاموشی نظر آتی ہے۔ سیاست دان بیوروکریٹس اربوں روپوں کی کرپشن کرے۔ آسانی دوسرے ملک فرار ہو جاتے ہیں لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی عملی طور پر دکھائی نہیں دیتی ہے۔ عوام کی عدم دلچسپی مزید مشکلات میں اضافہ کرتی ہے۔

## افغانستان جنگ میں پاکستان کا کردار

آمریت جمہوریت کے متضاد طرز حکومت ہے۔ آمریت میں کوئی شخص ملک میں موجود قانون کو توڑ کر یا اُس کو نظر انداز کر اُس علاقے یا ملک پر حکومت کرتا ہے۔ اس میں زیادہ تر اختیارات ایک فرد کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس طرز کے دور حکومت میں اُس کی پالیسیوں پر تنقید کرنا یا اُن کی مخالفت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں بھی تین مارشل لاء لگے ہیں۔ پاکستانی سیاسی تاریخ میں آمریت کے ادوار گزرے ہیں۔ جن میں جنرل ایوب خان کا دور، ضیاء الحق کا دور اور جنرل پرویز مشرف کا دور قابل ذکر ہیں۔ جنرل یحییٰ نے بھی پاکستان میں کچھ عرصہ حکومت کی۔ آمریت کے اس دور پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات اور معاملات میں سول حکومت کو بات کرنے کا اختیار نہیں ہوتا اور اس دور میں عام عوام کو بھی سیاسی معاملات میں دخل اندازی کا حق حاصل ہی نہیں ہوتا۔ تمام اختیارات کا مالک صرف ایک شخص ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے بغیر کسی مشاورت کے اپنے فیصلے کر سکتا ہے۔ آمریت کے اس دور میں کسی شخص کے اندر ایسی جرات نہیں ہوتی ہے کہ وہ آمر کی غلط پالیسیوں کے خلاف احتجاج کرے۔

پاکستان کی سیاسی اور معاشی حالات کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں بے شک کوئی بھی حکومت ہو کوئی جمہوری شخص حکومت کرے یا کوئی آمر ملکی قانون کی دھجیاں اڑا کر اقتدار پر قابض ہو جائے دونوں کی حکومتوں میں چند افراد کا ٹولہ محض اپنے کاروبار کو مضبوط کرنا ہے۔ اُن کے اس عمل پر کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہوتی اور اگر بات کر بھی لی جائے تو وہ شخص غدار کہلاتا ہے۔ اس دوران عوام کو کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ اُس کی فلاح و بہبود کے لیے کتنے فیصد ملکی بجٹ جاتا ہے۔ کون سے اداروں کی ضرورت ہے کن کن ملکی قوانین کو بدل دینا چاہے کیسے کسی غیر قانونی اقدام کو قانونی حیثیت دلوائی جاتی ہے یا آمریت پس ایک آمر سے بہتر کوئی نہیں جانتا ہے۔ ریاض حسین اپنے ایک بلاگ "۷۰ برس میں بیشتر وقت پاکستان میں آمریت کا سایا رہا" میں آمریت کے دور کی خامی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"پاکستان میں جہاں گذشتہ ۷۰ برس میں فوج کا اثر و رسوخ بڑھا ہے۔ وہیں چینی اور کھاد

کے کارخانوں سے لے کر بیکری تک کے کاروبار میں اس کی شراکت داری میں بھی اضافہ

ہوا ہے تو کیا اقتدار کی وجہ کاروبار کی وسعت یا استحکام ہوتا ہے۔" (۳۴)

ملکی استحکام اور غیر یقینی سیاسی صورت حال کو بنیاد بنا کر اقتدار میں آنے والوں نے ملک استحکام بخشا ہو یا نا بخشا ہو اداروں نے کاروبار میں ضرور اضافہ کیا ہے۔ آمریت کے ان ادوار میں آمروں کی خارجہ پالیسی نے بھی پاکستان کو بہت متاثر کیا ہے۔ اُن کی غلط پالیسیوں کی سزا اور ڈالروں کی غلامی کا خمیازہ اس ملک نے بہت عرصہ تک بھگتا ہے۔ ان آمروں کی پالیسی امریکی سرکار کو خوش کرنا اور اُس کے بدلے میں ڈالر حاصل کرنا اور ڈالرز کو اپنے کاروبار پر لگانا اور تمام ثبوتوں کو مٹا دینا، ڈرانادھمکانا تک ہی محدود رہی۔ ان کے دور حکومت میں ہونے والی خارجہ پالیسی نے کسی حد تک پاکستانی سماج کو متاثر کیا اور کتنا نقصان پاکستانی عوام کے حصے میں آیا۔ اُن کی غلط اور محکومانہ خارجہ پالیسی کس طرح آج تک پاکستان کو متاثر کر رہی ہے اور کیسے پاکستان کے اپنے برادر مسلمان ممالک کے ساتھ تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ آمریت کے اُس دور کی خامی اور کمزور خارجہ پالیسی پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ خارجہ پالیسی جو پاکستان کو افغانستان جنگ میں گھسیٹ کر لے گئی۔ جس کی بدولت ہم نے پرانی جنگ کو اپنے گھر میں آنے کی دعوت دی اور جس کی بھرپور حمایت ہمارے جنرل نے کی۔ جہاد کا مفہوم بدلنے والے کو جذباتی لوگوں نے ہیر و کالقب دیا۔ جس کی ہیر و گری کی سزا پاکستان ۱۹۷۷ء سے لے کر ۲۰۲۲ء تک بھگت رہا ہے۔ افغانستان جنگ سے شروع ہونے والے اس جہاد نے بعد میں دہشت گردی کا رخ اختیار کر لیا۔ اُس دہشت گردی میں ہزاروں افراد کا قتل ایک آمر کی جہاد سے محبت کا واضح ثبوت دیتا ہے اور اُس جہاد کی قیمت افغانستان اور پاکستان میں بسنے والے لوگوں نے ادا کی۔ اقتدار سے جونک کی مانند چمٹے ہوئے لوگوں نے مالی فوائد حاصل کیے اور عام عوام نے اُن مالی فوائد کی قیمت ادا کی۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "افغانستان کتنا پیارا تھا" میں علامتی انداز بیان کو اختیار کرتے ہوئے افغانستان میں جہادی جنگ کے ماسٹر مائنڈ اور امریکہ کے ایک اہم اتحادی آمر کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

"افغانستان پر پہلی بری نظر سویت یونین نے ڈالی اور پاکستان نے بھی اسے اپنے مفادات کی خاطر ایک مونچھوں والے کی آمریت کی خاطر ڈالی سب لوگوں نے جھولیاں بھریں جن میں سی آئی اے کے عطا کردہ ڈالروں کے ڈھیرے تھے اور پھر رہی سہی کسر طالب نے نکال دی۔" (۳۵)

افغانستان جنگ میں پاکستان کا روس کے خلاف اور امریکہ کا ساتھ اُس کو اپنے ہوائی اڈے فراہم کرنا، افغانستان میں لوگوں کو تربیت مہیا کر کے روس کے خلاف جہاد کی ترویج میں بہت اہم کردار رہا۔ روس کی شکست کے بعد وہاں امریکی حکومت قیام اور افغانستان کی تعمیر و ترقی اور بحالی تک پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیا۔ پرانی جنگ میں کودنے اور اس کو اپنے گھر تک لانے والے ایک آمر کی پالیسی کے اثرات ایک عرصہ تک ہمارے سماج پر چھائے رہے اور اس کی بھاری قیمت پاکستان نے ادا کی ہے۔ افغانستان میں آنے والی حکومتوں کے رویے پاکستان کے ساتھ تعلقات بہتر نہیں دکھائی دیے۔ انھوں نے پاکستان کے بجائے غیر اسلامی ممالک کو ہمیشہ اہمیت دی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ افغانستان حکومتوں کے اس طرز عمل کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ صرف افغان عوام تھے جن کے دل میں ہم پاکستانیوں کے لیے نرم گوشہ تھا ورنہ وہاں کی جو حکومت ہوتی پاکستان کی جانی دشمن ہوتی۔" (۳۶)

امریکہ روس کی اس جنگ میں پاکستان کا استعمال اور یہاں کے آمروں کے ڈالروں کی لالچ نے پاکستانی سماج میں بہت مسائل پیدا کیے۔ افغانستان سے ہجرت کر کے آنے والے لاکھوں مہاجرین کو اپنے اندر پناہ دی جو ملکی معیشت کی تباہی اور مسائل میں اضافے کا سبب بنے۔

## پاکستان کے دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات

پاکستان دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دوسرے ممالک کی نظروں میں پاکستان اور پاکستان کے ساتھ تعلقات کی کیا اہمیت ہے اور ان کے کس حد تک پاکستان کے ساتھ تعلقات ہیں۔ ایک ملک جب وہ وجود میں آتا ہے تو دنیا کے باقی ممالک کے ساتھ اُس کو تعلقات قائم کرنے ہی پڑتے ہیں تاکہ تجارتی طور پر درآمدات اور برآمدات کا دوسرے ممالک کے ساتھ سلسلہ شروع کیا جائے اور مشکل وقت میں دوست ممالک کا تعاون حاصل کیا جائے۔ پاکستان کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات اور تجارتی معاہدات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ممالک کے ساتھ تجارتی معاہدات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ان ممالک میں چین، امریکہ، روس، بھارت، افغانستان، بنگلہ دیش جیسے ممالک شامل ہیں۔ ان ممالک کے ساتھ تعلقات باتوں کی حد تک برابری کے ہیں مگر ان ممالک کا پاکستان کے ساتھ کیا رویہ رہا ہے اور ابھی اُن کا پاکستان کے ساتھ رویہ کیسا ہے۔

دنیا کی بدلتی ہوئی سیاسی اور معاشی صورت حال کی طرح پاکستان میں بھی اب تک بہت سی سیاسی اور معاشی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ایک آزاد ملک اور ایک مضبوط معیشت رکھنا والا ملک دوسرے ممالک کے ساتھ آزاد اور بیرونی تسلط سے پاک تعلقات بنا سکتا ہے۔ وہ ملک جس طرح چاہتا ہے معاہدہ کرتا ہے کیونکہ اس پر بیرونی دباؤ بہت کم ہوتا ہے۔ وہ آزادی کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے کوئی بھی معاہدہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ملک جس کے پاس سرمایہ کم ہو جس کی معیشت مضبوط نہ ہو یا اُس ملک کی معیشت کو وہاں کے حکمرانوں جرنیلوں بیوروکریٹس کی جانب سے بری طرح لوٹ کر بیرون ملک میں سونے کاؤنٹس بھرے ہوں اور جائیدادیں خریدی ہوں۔

وہ ملک آزادی کے ساتھ دوسرے ممالک کے ساتھ کیسے تعلقات میں بنا سکتا ہے۔ وہ ملک جو بیرونی امداد اور قرضوں پر چلتا ہے جس ملک کی معیشت کا واحد سہارا آئی۔ ایم۔ ایف سے ملنے والی امداد پر ہو اور وہ اپنی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دینے کے لیے بروقت امریکی ڈالروں کی بھیک مانگتا ہو وہ ملک کبھی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات نہیں بنا سکتا۔ پاکستان کو بھی ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے۔ وہ برابری کی سطح پر کسی ملک کے ساتھ تعلقات قائم نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی آزادانہ طور پر کسی بھی ملک کے ساتھ کوئی تجارتی معاہدہ ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں ایران پاکستان گیس پائپ لائن روس سے آزادانہ تجارت کے معاہدات جیسے بہت سے ایسے منصوبے ہیں جو ہمیں امداد فراہم کرنے والے ممالک کے حق میں نہیں ہیں۔ جن حکومتوں یا حکومتی ارکان نے امداد دینے والے ممالک کے خلاف جاکر ہر وہ معاہدہ کرنے کی کوشش کی جس سے امداد دینے والے ممالک کا کسی طرح متاثر ہونے کا خدشہ ہو۔ وہ معاہدہ کرنے والے کو منظر عام سے ہٹا دیا جاتا ہے یا اُس حکومت کو مختلف سازشوں کے ذریعے اقتدار سے الگ کر دیا جاتا ہے اور کبھی آزادانہ تعلقات کی پاداش میں ایک منتخب جمہوری وزیراعظم کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا کر راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔

کسی بھی ملک کے ساتھ برابری کے تعلقات کے لیے معیشت کا مضبوط ہونا ضروری ہے تاکہ وہ ملک اپنے فیصلوں میں آزاد ہو اور آسانی کے ساتھ اپنے ملک اور قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین فیصلے کر سکے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے ایک کالم "خواب سارے خام سارے" میں پاکستان کے دیگر ممالک کے ساتھ تعلقات اور ان ممالک کا رویہ بیان کرتے ہیں۔ افغانستان پاکستان کے تعلقات آغاز سے ہی اچھے نہیں تھے۔ پھر بھی پاکستان نے

افغان جنگ میں بظاہر افغانستان کا ساتھ دیا۔ اُس کے بدلے میں افغانستان کا پاکستان کے ساتھ رویہ ہمیشہ سے جو رہا وہ دنیا کے سامنے ہے۔ افغانستان جنگ میں لاکھوں افراد کو پاکستان نے اپنے سینے پر جگہ دی۔ روس کے خلاف جہادی درس دے کر پاکستانی نوجوانوں کو بھیجا تا کہ روس کے خلاف جنگ جیتی جاسکتی۔ ہر ممکن مالی و جانی مدد کی گئی۔ اس سب کے باوجود افغانستان کا رویے کے متعلق مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"افغانستان کے لیے ہم نے اپنی سلامتی کو داؤ پر لگا دیا۔ اپنے آپ کلاشکوف کلچر اور ہیروئن اور بم دھماکوں سے تباہ کر لیا تو کیا سارے افغان آج ہم سے محبت کرتے ہیں۔۔۔ میں افغانستان سے گزرا ہوں اور اس کے سلوک کو جانتا ہوں۔ داؤد کے زمانے کا افغانستان اور شدید پاکستان مخالف اور پختونستان بیرک کارمل کا کمیونسٹ زمانے ظاہر ہے ہم سے ہمدردی نہیں رکھتا تھا۔۔۔ کمزور کرزائی کا افغانستان اگرچہ ہم دونوں امریکہ کے قریبی حواریوں میں شامل ہیں لیکن کرزئی اور عبداللہ جب بولتے ہیں ہمارے خلاف زہر اگلے ہیں۔" (۳۷)

افغانستان کا پاکستان کے ساتھ ہمیشہ ہی رویہ سخت رہا اور ان دونوں ممالک کے درمیان تعلقات سرد مہری ہی اختیار کیا ہوتے رہے۔ افغانستان کے اندر سے ہو کر بلوچستان میں بھارتی مداخلت کے شواہد بہت بار ہمارے قانون نافذ کرے والے اداروں کو مل چکے ہیں۔ افغان جنگ ہم اپنی جنگ سمجھ کر لڑنے والے پاکستان کا انعام شاید یہی ہے۔ پاکستان کے ایران اور عراق سے تعلقات بھی ملے جلے ہی رہتے ہیں اکثر ان تعلقات میں اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایران کے ساتھ تجارتی منصوبے ہماری ایک حکومت کرتی ہے مگر دوسری حکومت یا وہی حکومت بیرونی دباؤ میں آکر ایران سے کیے ہوئے منصوبے ترک کر دیتی ہے۔ امریکہ کی حد درجہ مداخلت ایران پاک تعلقات کو بہت متاثر کرتی ہے۔ عراق اور پاکستان کے درمیان تعلقات بھی مختلف حکومتوں میں بدلتے رہے۔ عراق پر امریکی جارحیت کی ہم نے تقریروں میں بہت مخالفت کی عراقیوں پر امریکی ظلم و ستم کے خلاف باتیں کی صدام حسین کی سزا موت پر ہماری جذباتی عوام نے آنسو بہائے۔ عراق سے تعلقات پر مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"عراق کے تعلقات ہمیشہ ہندوستان سے زیادہ دوستانہ رہے۔ صدام حسین نے کبھی ہمارے بارے میں خیر کا ایک لفظ نہ کہا۔" (۳۸)

بیرونی مداخلت کے علاوہ مسلمان ممالک کا مذہبی فرقہ بندی اُن کے تعلقات میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ مسلمان جن کو تفرقہ میں ناپڑے کا حکم دیا گیا تھا۔ تمام مسلمانوں جسد واحد قرار دیا گیا تھا۔ ایک مسلمان کا غم دوسرے مسلمان غم قرار دیا گیا تھا مگر گزرے وقت کے ساتھ ہم نے اپنی اصل تعلیمات کو مکمل طور پر بھلا دیا ہے۔ آپس میں تفرقہ پیدا کر دیا ہے۔ مختلف گروہوں میں ہم اب بٹ کر رہ گئے ہیں جس کا بھرپور فائدہ اسلام اور مسلمان دشمن قوتوں نے اٹھایا ہے۔ ان قوتوں کا بھرپور ساتھ کچھ اسلامی ممالک نے محض اپنے ذاتی مفاد کے لیے دیے اور مسلمہ امہ کو بکھیرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مضبوط معیشت والے اسلامی ممالک مغربی طاقتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کمزور معیشت رکھنے والے ممالک کی کوئی خاطر خواہ مدد دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ یہ بااثر اسلامی ممالک دوسرے اسلامی ملک کو بھی مجبور کر رہے ہیں کہ وہ مغربی طاقتوں کی غلط اور نقصان دہ باتیں تسلیم کریں۔ نہ ماننے کی صورت میں تجارت روک دی جاتی ہے اور ترقیاتی منصوبوں پر بھی معاہدات منسوخ کر دیے جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ سعودی عرب کے پاکستان کے ساتھ رویے کو اپنے ایک کالم میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

"سعودی عرب میں آپ ساری عمر ایڑھیاں رگڑنے اور ان کی غلامی میں گزار دیں پھر بھی آپ کو شہریت کا اہل نہیں سمجھا جاتا۔ وہ آپ کو بھیک تو دے سکتے ہیں لیکن برابری کی سطح پر ہاتھ نہیں ملا سکتے، اس لیے ہم ان کے دربار میں حاضری دینے کے لیے تقریباً ہر دو چار ماہ کے بعد حاضر ہو جانے میں وہ کبھی ہمارے جھونپڑے کی طرف رخ نہیں کرتے اور کیوں کریں آقا اور غلام میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے۔" (۳۹)

سعودی عرب سے ہم برابری کی بات نہیں کر سکتے کیونکہ ہم نے وہاں سے امداد لینی ہوتی ہے۔ دوسرا سعودی عرب کے امریکہ اور مغربی قوتوں کے ساتھ تعلقات مضبوط ہیں جس کی وجہ سے ہمیں ہر صورت امریکہ کے ساتھ ساتھ سعودی غلامی بھی کرنی ہوتی ہے اور ان کے ہر اسلام دشمن اور پاکستان دشمن اقدام کا ساتھ دینا پڑتا ہے۔ پاکستانی کمیونٹی ایک بڑی تعداد میں سعودی عرب میں کاروبار کرتی ہے۔ ہزاروں کے حساب سے پاکستانی ملازم وہاں کام کرتے ہیں۔ سعودی افواج کی ٹریننگ پاکستانی فوج کرتی ہے جس کے عوض معاوضے وصول کیا جاتا ہے۔ اپنی کمزور معیشت کے ساتھ ساتھ چند باتوں کو مد نظر رکھ کر ہمارا ملک سعودی عرب کی اسلام ٹھیکیداری کو قبول کرنا ہے۔

## پاکستانی حکومتوں کا امریکا نواز رویہ

پاکستان امریکہ تعلقات کا آغاز قیام پاکستان کے کچھ وقت کے بعد ہی ہو گیا تھا۔ اپنے قیام سے لے کر آج تک پاکستانی حکمران، جرنیل، امریکہ کے ساتھ تعلقات دل و جان سے نبھا رہے ہیں۔ یہ سچ ہے امریکہ نے پاکستان کی کمزور معیشت کو سہارا دینے کے لیے ڈالروں کی امداد مختلف ادوار میں دیتا رہا۔ ہر دور میں ہماری اسٹیبلشمنٹ خوشی سے ان ڈالروں کو آپس میں تقسیم کرتی رہی۔ عوام اور ملک کی ترقی و بہبود کے لیے یہ ڈالر ز کم ہی استعمال ہوئے ہیں۔ ہم ان ڈالروں کی قیمت ادا کرنے کے لیے ہر دور میں تیار رہتے ہیں۔ ان ڈالروں کی بدولت امریکہ ہم سے اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کرواتا ہے۔ ایسا کوئی فیصلہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کے ہاتھ میں نہیں ہے جو وہ آزادی سے کر سکے۔ پاکستانی تاریخ میں مختلف حکومتوں کے رویے سب کے سامنے عیاں ہیں۔ جس حکومت کا رویہ امریکہ کے ساتھ سرد مہری پر مبنی ہو جو اپنی خود مختاری کو اولیت دیتا ہو، امریکہ کی غلط پالیسیوں کو نہ مانے دنیا نے دیکھا کہ وہ حکومت اور وہ لیڈر جو امریکہ کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے، اس شخص اور اس حکومت کو اپنے ہی ملک سے ڈالروں کے عوض خریدے گئے مذہبی ٹھیکیداروں نے منافقانہ چالوں سے عدالتوں کو ساتھ ملا کر اقتدار سے الگ کیا اور ان لوگوں کو مسلط کیا جنہوں نے سب پہلے ہی اس ملک کو ڈالروں کے عوض گروی رکھا ہوتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "چچا سام کے نام ایک اور خط" میں پاکستان کی اس غلامانہ سوچ ڈالروں کی طرف جھکاؤ اور ان کی تقسیم کے متعلق لکھتے ہیں:

"چاچا جی میں اپنی خدمات کی فہرست پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ ان کے عوض آپ نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ بہت کچھ نیچے عوام تک نہیں پہنچا اور اوپر ہی اوپر تقسیم ہو گیا ہے۔" (۳۰)

امریکہ اپنے دیے گئے ڈالروں کے بدلے پاکستان کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پاکستان نے کسی ملک کے ساتھ کس قسم کے تعلقات رکھنے ہیں اور کس حد تک تعلقات رکھنے ہیں۔ جو نہیں پاکستان اور دوسرے ممالک کے تعلقات بہتری کی جانب جانے لگتے ہیں اور ان تعلقات سے پاکستان کی خود مختاری کے لیے ایک اہم سنگ میل ثابت ہوتے ہیں۔ پاکستان بیرونی دباؤ میں آکر اپنے فیصلے بدلنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور حالات ایک دفعہ پھر اپنی پرانی ڈگر پر چل پڑتے ہیں۔ امریکہ نے پاکستان کو اپنے مقاصد کے لیے روز اول سے ہی استعمال کرتا ہے

اور اس کے بدلے ڈالرز دے کر ہمارے منہ بند کروا دیتا ہے۔ وہ ڈالرز پھر گردش کر کے وہاں جائیدادیں بنانے کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔

امریکی رویوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ نے پاکستان کو محض اپنے ناجائز مقاصد کو پورا کرنے کے لیے دوست بنا رکھا ہے اور وہ دوست جس سے ہمیشہ سے وہ قربانی کا مطالبہ کرتے رہے۔ وہ دوست جس کے کندھے پر بندوق رکھ کر امریکہ خطہ کے باقی ممالک کو ٹارگٹ کرتا ہے۔ افغانستان میں روس کی شکست پاکستان کے بھرپور تعاون سے ممکن ہوئی۔ پاکستان نے افغان جنگ میں امریکہ کا بھرپور ساتھ دیا روس کے خلاف اپنی سرزمین کی اجازت دی گئی اور یوں پاکستان کے فضائی حدود کو استعمال میں لا کر امریکہ نے روس کو شکست دی۔ اس جنگ میں پاکستان کا کتنا نقصان ہوا۔ پاکستانی معاشرہ اس جنگ سے کتنا متاثر ہوا۔ امریکہ کو اس بات سے کوئی فرق ناپڑا کیونکہ اس نے پاکستان سے دوستی کا حق زبردستی ادا کروایا۔ دوستی کے بدلے امریکہ نے ڈالروں کی خوب بارش کی۔ مسلمان بالخصوص پاکستانی امریکہ کی اس جنگ سے پہلے جہاد جیسی صفت سے تقریباً قیام پاکستان کے بعد نابلد ہو چکے تھے۔ ایک دفعہ پورے جوش و خروش سے نہایت اندھے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے افغانستان میں روس کے ٹینکوں کے آگے لیٹ گئے۔ اپنے ہی ملک میں ایک دوسرے کو کافر کہنے والے ایک کافر ملک کے لیے جہاد کرتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے کالم میں افغانستان جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کے نقصانات کے متعلق تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پھر افغانستان میں روس کیا آئے آپ کی پاکستان کی اور ضیاء الحق کی لاٹری نکل آئی۔ آپ نے روسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے مسلمانوں میں جہاد کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ مجاہدین آپ کے لیے سگے بیٹوں سے بھی زیادہ چہیتے اور لاڈلے ہو گئے نہ صرف آپ نے ان کی جھولیاں ڈالروں سے بھر دیں بلکہ انہیں ٹریننگ بھی دی اور آپ ہی کے تربیت یافتہ اسامہ بن لادن بھی ان مجاہدین میں شامل تھے۔" (۴۱)

پاکستان نے افغانستان جنگ میں اپنے نوجوانوں کو امریکہ کی مدد سے ٹریننگ دے کر افغانستان بھیجا۔ جہاں انھوں نے جہاد کی روح کو عملی طور پر کام میں لا کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے ایک کافر ملک کو فائدہ پہنچایا اور ان کی جان کے بدلے میں ملنے والے ڈالرز ملک کے ضمیر فروش جرنیل ہڑپ کر گئے۔ افغانستان جنگ میں ساتھ دے

کر کیا نتائج اپنی جھولی میں ڈالے، مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"پاکستان میں بھی بہت سے لوگوں نے اپنی جھولیاں بھریں۔ کچھ نے ڈالروں سے کچھ نے کلاشنکوفوں سے اور کچھ نے ہیر وئن سے مالا مال کر دیا۔ ہم اپنے ملک کو فراموش کر کے افغانستان کے دفاع میں جت گئے۔" (۴۲)

افغانستان میں روس کی پسپائی کے بعد امریکہ کا افغانستان اور پاکستان کے ساتھ رویہ بدل گیا کیونکہ وہ جو چاہتا تھا اُسے مل چکا تھا۔ وہ لوگ جن کو ٹریننگ فراہم کر کے طالبان کی صورت میں پیدا کیا وہی بعد میں امریکہ کے حلق کا کاٹنا بن گئے۔ نائن الیون کے واقعہ کو بنیاد بنا کر امریکہ کو دہشت گردی کا ایک نیا مہرہ مل گیا جس کو آج تک وہ استعمال کر رہا ہے۔ وہ جہادی لوگ جو کل تک امریکی جہاد لڑ رہے تھے۔ یک دم امریکہ نے اُن سے منہ موڑ لیا۔ امریکہ کے اس یوٹرن کے متعلق مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

"بہر حال جو نہی سویت یونین شکست خوردہ ہو کر پیچھے ہٹا آپ بھی پیچھے ہٹ گئے نہ پھر افغانستان کی خبر لی اور نہ ہماری۔۔۔ ستمبر میں جو بربادی ہوئی ہم وہ واحد قوم تھے جنہوں نے ایک ہی ٹیلی فون کے سنتے ہی بغیر کسی سے مشورہ کیے جی ہاں بہت بہتر ہم آپ کے ساتھ میں کا اعلان کر دیا۔" (۴۳)

افغانستان میں جنگ میں امریکہ کے ساتھ روس کے مقابلے میں طالبان پیدا کر کے اُن کو ٹریننگ فراہم کر کے تیار کیا گیا۔ پھر نائن الیون میں دہشت گردی کا الزام لگا کر امریکہ نے نیا طریقہ ڈھونڈا جس کی حمایت بغیر کسی سوچ سمجھ کے ہم نے کی اور ایک دفع پھر امریکی کی انسانیت دشمن پالیسیوں میں اُس کا ساتھ دیا۔ اس دہشت گردی کا بہانہ بنا کر امریکہ نے پاکستان میں بھرپور فوجی کارروائیاں کی ہیں۔ افغانستان کی جنگ کو گھسیٹ کر اپنے قبائلی علاقوں تک لے آتے جس کی قیمت پاکستانیوں نے اپنی جان دے کر ادا کی۔ پاکستان کی سلامتی صرف اور صرف اُس وقت متاثر ہوئی جب انڈیا کا کوئی ڈرون طیارہ سرحد عبور کر جائے پاکستان کو اپنی سلامتی کے لالے پڑ جاتے ہیں مگر امریکی فوج آ کر پاکستانی سرحدوں کے اندر ٹھکانے تباہ کر جاتی ہے، اُس سے پاکستان کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ یہ ڈالر کا ہی اثر ہے جگہ نہ دینے پر ڈالر ز کے بند ہو جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ امریکہ کے کہنے کے مطابق پاکستان نے دہشت گردی کے الزام میں لوگ امریکہ کے حوالے کر دیے حالانکہ عدالتیں پاکستان میں بھی

موجود ہیں کاروائی یہاں پر بھی عمل میں لائی جاسکتی ہے مگر یہ بھی ڈالر کا اثر ہے کہ ہم نے لوگ پکڑ کر ان کے حوالے کر دیتے۔ مستنصر حسین تارڑ امریکی غلامی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگرچہ آپ کی حکومت کے ایک اہلکار نے یہاں تک کہہ دیا کہ پاکستانی اپنی ماؤں کو بھی بیچ سکتے ہیں۔ اس میں سارا قصور آپ کا ہے چاچا جی۔ ہم سب انعام کی رقم اتنی زیادہ رکھ دیتے ہیں کہ ہم مجبور ہو کر کسی نہ کسی کو آپ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اب دیکھیں کہ ہم آپ کی خاطر اسرائیل کو بھی مسلم کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔" (۴۴)

پاکستانی امریکی وفاداری کے تمام بھیانک نتائج کو جانتے ہوئے ہر وقت اُس کی وفاداری کرنے کو تیار رہتے ہیں یہ ڈالر سے وفاداری ہر موقع پر مہنگی پڑتی ہے اور اس وفاداری کی ایک بڑی قیمت پاکستان نے ادا کی۔ مستنصر حسین تارڑ اس قدر وفاداری پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"انکل سام! اب آپ بتائیے کہ ہم آپ کی ایک سیٹ بھی بننے کو تیار ہیں تاکہ یکدم امریکی ہی ہو جائیں اور خوشحال ہو جائیں لیکن آپ بڑے سیانے ہیں آپ ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ایک امریکی سیٹ کے بھی اپنے ریاستی قانون ہوتے ہیں وہ اتنے وفادار نہیں ہو سکتے جیسے ہم ہیں۔" (۴۶)

پاکستان میں امریکہ مخالف حکومت بننا بہت مشکل ہے۔ تاریخ گواہ ہے جس حکومت نے امریکی پالیسی سے ذرا ہٹنے کی کوشش کی پھانسی کا پھندہ یا اقتدار سے برطرفی اس کا مقدر بنی۔ ہمارے نظام میں ایسے بہت افراد ہیں اور جو با اثر ہیں۔ ان کا ڈالر سے پیار امریکہ مخالف، خود مختار لیڈر اور خود مختار حکومت کے قیام میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔ ہم کسی صورت امریکہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت میں ہماری معیشت کو ہمارے حکمرانوں، کرپٹ جرنیلوں اور بیوروکریٹس نے اپنی ضمیر فروشی کے سبب کم زور کر دیا ہے۔ خود مختاری اور سلامتی کا سودا ہم نے ڈالروں کے بدلہ کر دیا ہے۔ کسی بھی ڈرون حملے کو ہم محض باتوں میں ٹال دیتے ہیں۔ ڈالروں سے پیار ہمیں کسی بھی امریکی پالیسی کی حمایت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اس امر کا اشارہ اپنے کالم میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

"یقین کیجیے پاکستان میں کسی امریکی مخالف حکومت کے آنے کا اتنا ہی امکان ہے جتنا فیڈل کا شکرو کا امریکی صدر بن جانے کا ہے۔" (۴۶)

پاکستان کی امریکہ نوازان پالیسیوں سے ہمارے اپنے ملک کا نقصان ہوتا ہے اور اس نقصان کی قیمت عوام کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ افغانستان جنگ میں سوچے سمجھے بغیر کو دنا امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانا انسانیت کش پالیسیوں میں اُس کا ساتھ دینا بدلے میں امریکہ ہر بار پاکستان کو استعمال کر کے مصیبتوں کے نئے جال میں ڈال کر ہمیشہ کنارہ کش ہو گیا جس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ امریکہ سے وفا کی قیمت ڈالروں کی صورت میں ادا کر دی گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم "معیاری بے عزتی اور کابل میں چیختی عورت" میں پاکستانی بے جا وفاداری کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"اگر صدر بش آدھی رات کے وقت ہمارے صدر صاحب کو ایک ٹیلی فون کرتے ہیں تو ہماری عزت تو نہیں کرتے۔ نہایت اہتمام سے معیاری بے عزتی کرتے ہیں اور ہم لیس سر کہتے ہوئے کھڑے ہو کر سیلوٹ کرتے ہیں کہ تھنک یو سر چلیے امریکہ کے صدر سے بے عزتی کروانے میں کچھ خاص حرج نہیں کہ بس اس کی عادت ہو چکی ہے۔" (۴۷)

امریکہ نوازان پالیسیوں کے باوجود اپنا تن من دھن لٹا کر بھی امریکہ ہمیشہ پاکستان کے ساتھ ڈپلومیٹک رویہ اختیار کرتا ہے جب بھی کوئی مشکل وقت آتا ہے پاکستان پر جب اُسے امریکہ کے ساتھ کی ضرورت ہوتی ہے امریکہ محض دلاسوں سے کام لیتا ہے۔

## حکمرانوں کا جبر

پاکستانی سیاست دان الیکشن کے دنوں میں عوام میں گھلے ملے ہوتے ہیں۔ اگر یہی اپنائیت، پیار اور ہمدردی وہ الیکشن کے جیتنے کے بعد عملی طور پر دکھائیں تو عوام کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور سیاست دونوں کی جاری روایت کو توڑنے میں واقعی مدد ملے گی۔ الیکشن کے دنوں میں وہ لوگ جو قومی اور صوبائی اسمبلی کے ارکان ہوتے ہیں۔ عوام کے ووٹ سے منتخب ہوتے ہیں، عوام میں جا کر بلند بانگ دعوے کرتے ہیں۔ منتخب ہوتے ہیں، خلف اٹھاتے ہیں جس میں عوام کو سب کچھ مان کر عوام کی دل و جان سے خدمت کرنے کا عہد ہوتا ہے مگر اقتدار پہنچ کر اپنی روایت تو برقرار رکھتے ہیں۔ ان کے بلند و بانگ دعوے محض دعوے ہی ثابت ہوتے ہیں وہ اپنی مدت پچھلی حکومت کی نااہلی کی داستان سناتے سناتے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ اور پھر جیسے ہی اگلی حکومت آتی ہے وہ بھی یہی روایتی طریقہ کار اختیار کر لیتی ہے۔ ان سب میں عوام کے اور ملکی مسائل دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

اقتدار میں موجود حکومت اپنا وقت جب پورا کر کے جاتی ہے تو آنے والی حکومت کے لیے مسائل چھوڑ جاتی ہے۔ آنے والی حکومت میں کچھ لوگ نااہل ہوتے ہیں جو مسائل کی جانب توجہ نہیں دیتے ہیں۔ اُن حل کے لیے کوئی خاطر خواہ اقدامات نہیں کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام بے چینی کا شکار ہوتی ہے اور وہ مسائل مزید بڑھ جاتے ہیں۔ اس دوران سیاسی اراکین باقاعدہ اس بات کا اعلان کرتے رہتے ہیں کہ وہ عوامی مسائل سے آگاہ ہیں اور اُن مسائل کو ختم کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ مگر ان کے دعوؤں میں کوئی سچائی نہیں ہوتی جو سبز باغ دکھا کر وہ عوام سے ووٹ بٹور کر اقتدار میں آ جاتے ہیں وہ وعدہ پورے نہیں کرتے ہیں۔

اقتدار میں رہ کر ملکی خزانے کو اپنے اکاؤنٹ میں بھر کر اپنی جائیدادیں بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔ پاکستان میں ان کی حکومت کے خاتمہ کے بعد وہ اپنی اصل رہائش کی طرف چلے جاتے ہیں اور پھر اگلے الیکشن میں دوبارہ پاکستان کا رخ کر لیتے ہیں۔ سیاست دانوں کے اس روپ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان میں وہ محض حکومت کرنے آتے ہیں۔ بیرون ملک ایک شاہانہ زندگی گزارنے والا وزیر پاکستان کے اندر بسنے والے ایک غریب کے مسائل کو کیسے جان سکتے ہیں۔ مسائل کو جاننے کے لیے اس سماج کے اندر ہونا ضروری ہے، لوگوں کے حالات زندگی کے بارے میں جاننا ضروری ہے مگر بد قسمتی سے ہماری سیاست میں یہ روایت موجود نہیں ہے۔ ان کے دور حکومت میں اگر کوئی قدرتی آفت آجائے یہ پورے شاندار پروٹوکول کے ساتھ اُس علاقے کا دورہ کریں گے۔ عوام کو وہی جھوٹی تسلی اور دلا سے دے کر وہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ ٹی وی شوز میں اکثر ان کو بلایا جائے تو ان کی لڑائیاں ختم نہیں ہوتی ہیں۔ آپس میں لڑائیاں، ایک دوسرے کو غیر اخلاقی نام سے پکارنا، مار پٹائی، گالی گلوچ نا صرف ٹی وی چینلز پر ہوتا ہے بلکہ قومی اسمبلیوں اور صوبائی اسمبلیوں میں پوری دنیا کو عام دیکھنے کو ملتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہمارے سیاسی قائدین کے اس منفی رویے پر تنقید کرتے ہوئے اپنے ایک کالم "خفیہ لوگ اور خفیہ حکومت" میں لکھتے ہیں:

"اول تو کوئی لیڈر کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ٹیلی ویژن پر بھی نمودار نہیں ہوتا کہ آئے اور لوگوں کو تسلی دے کر ملک و قوم کے سامنے یہ مسائل ہیں اور ہم انھیں حل کرنے کے لیے یہ اقدام کر رہے ہیں کوئی ڈھارس بندھانے نہیں آتا اگر کوئی بھولا بھٹکا لیڈر ٹیلی ویژن پر آ جاتا ہے تو وہ بھی خفیہ رہتا ہے۔" (۳۸)

اگر کوئی سیاسی قائد کسی پروگرام میں ٹیلی فونک گفتگو کر لیں اور موجودہ صورت حال پر اُس سے کوئی سوال کرے تو عموماً ان کے جوابات کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں۔ تارڑ صاحب اپنے اسی کالم میں لکھتے ہیں:

"ملک میں بجلی کا شدید بحران ہے، کاروبار ٹھپ ہو چکے ہیں، جواب آتا ہے اچھا!! کیا آپ نہیں جانتے کہ ملک بحر انوں سے دوچار ہے۔ وہ پھر جواب دیتے ہیں اچھا۔ آٹا نہیں مل رہا آپ جانتے ہیں کہ آٹا نہیں مل رہا۔ اچھا تو آٹا نہیں مل رہا!! لوگ بھوک سے تنگ آکر خود کشیاں کر رہے ہیں۔ خود کشی اسلام میں حرام ہے۔" (۴۹)

سیاست دانوں کی عوامی مسائل سے بے خبری جھوٹ پر مبنی تقاریر، غلط بلند بانگ دعوے، اقتدار سے چمٹے رہنے کی خواہش ذاتی مفادات کا حصول مل کر پاکستان اور پاکستانی عوام کے لیے مشکلات میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔

سیاسی جماعتیں دوران الیکشن اپنے دعوؤں کی وجہ سے عوام میں مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ پاکستان کی ۷۵ پچھتر سال کی تاریخ میں سیاسی جماعتوں کی جانب سے دعوے بہت ہوئے ہیں۔ اُن دعوؤں پر اگر مکمل طور پر کام ہوتا تو آج کی صورت حال سیاسی منظر نامے پر بہت مختلف ہو سکتی تھی مگر ایسا نہیں ہوا۔ باتیں محض باتیں رہی عمل میں دلچسپی بہت کم نظر آئی جن کی وجہ سے حالات دن بدن مشکل ہوتے رہے۔ الیکشن سے پہلے جس عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے ان میں اٹھا بیٹھا جاتا ہے جن کی ہر ناگوار بات کو دل و جان سے قبول کیا جاتا ہے الیکشن کے بعد یہی عوام ہوتی ہے مگر سیاست دانوں کا چونکہ مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ منتخب حکومت اقتدار میں آجاتی ہے لہذا عوام سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ کل تک جو عوام میں کھڑے ہوتے تھے وہ اقتدار میں آکر شاہانہ پروٹوکول کے ساتھ جیتے ہیں۔ عدم دلچسپی کا مظاہر کیا جاتا ہے۔

بالفرض کسی حکومت یا سیاست دان کی کسی غلط پالیسی تسلیم نہ کرتے ہوئے عوام احتجاج کرتے ہوئے سڑکوں پر آجاتے یا عوام کی جانب سے اپنی کوئی بات منوانے کے لیے ایک جائز آئینی اور قانونی حق کا استعمال ہو پھر حکومت کی جانب سے ریاستی دہشت گردی کا مظاہر کرتے ہوئے اپنی ہی عوام پر ظلم کرتی ہے۔ کل تک عوام کا درد سمجھنے والے عوام کی فلاح و بہبود کی باتیں کرنے والے خود عوام پر پولیس کے ذریعے گولیاں برساتے ہیں۔ عوام کے نقصان سے ان کے جینے مرنے سے ان سیاست دانوں کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں اگر لوگ اپنے

حق کے لیے حکومت وقت کے کسی غلط قدم کی مخالفت میں سڑکوں پر آجاتے ہیں تو حکومت ان کی آواز دبانے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال کرتی ہے اور طاقت کے اس استعمال سے عوام کا ہی نقصان ہوتا ہے۔ وہ ان حادثات میں جان گنوا سکتا ہے۔

سیاسی جماعتیں اور ان کے قائدین جو عوام کی خدمت کا حلف لے کر عوام کے ایوانوں میں پہنچے ہوتے ہیں وہی اپنی عوام کے لیے سزا بن جاتے ہیں۔ فرعونیت ان کے عمل سے ظاہر ہو رہی ہوتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کے رویوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم "پاگلوں کو پکڑنے کا صحیح طریقہ" میں ایک عام شخص جو حکومتی اداروں کے رویوں سے تنگ آچکا ہوتا ہے اس کی حالت کو بیان کرتے ہیں:

"شریف آدمی ویسے بھی مضبوط الحواس ہی رہتا ہے غم روزگار کا مارا ہو مختلف حکومتی اور نیم حکومتی محکموں کا مارا ہوا بجلی کا بل زیادہ آجائے تو وہ اپنے بال نوچتا ہے۔ ٹیلی فون کا بل ہزاروں میں آجائے تو اسے ادا کرنا پڑتا ہے اور یوں نیم پاگل ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔ پانی کا بل اگر ادا کر دے اور رسید گم کر بیٹھے تو پانی کا محکمہ اپنے ریکارڈ چیک کر کے نہیں بتائے گا کہ پے منٹ ہوئی یا نہیں۔" (۵۰)

حکومت کی ان غلط پالیسیوں اور حکومتی اداروں کے تعاون نہ کرنے پر جب آدمی اپنے حق کے لیے احتجاج کرتا ہے۔ ہمارے سیاست دانوں کے عمل میں فرعونیت آجاتی ہے۔ وہ عام آدمی کو اپنی انھی غلط پالیسیوں اور عدم تعاون کی وجہ سے سڑکوں پر آنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ وہی عوام جس کو الیکشن میں اپنی حمایت میں لیتے ہیں بعد میں انہی عوام کی جان کی بھی پروا نہیں کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اہل سیاست کے اس عمل پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیڈران کرام اس شریف آدمی کو نعرے لگا لگا گلیوں اور بازاروں میں لے آتے ہیں اور اسے گولی مروا کر خود اپنے بنگلہ جات میں چلے جاتے ہیں۔" (۵۱)

سیاسی جماعتوں اور ان کے قائدین کے یہ رویے اور حکومتی اداروں پر کنٹرول ناہونا اور ان میں موجود افراد کا عدم تعاون عام عوام کے لیے بہت مسئلہ پیدا کرتا ہے۔

## بین الاقوامی سیاسی مسائل کا ادراک

مستنصر حسین تارڑ نہ صرف پاکستانی سماج کو درپیش سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنے کالم میں شامل کیا بلکہ وہ بین الاقوامی مسائل پر بھی بات کرتے ہیں۔ افغانستان میں امریکی افواج کا قبضہ، فلسطین پر اسرائیلی قبضہ اور اس پر عربوں کی خاموشی، عرب اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات، مسلمانوں کی نسل کشی، امریکہ کا منافقانہ رویہ، اہل مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت، دہشت گردی کی آڑ میں مسلمان ممالک پر حملہ اور ان کی معیشت کی تباہی، بھوک ان سب مسائل پر مستنصر حسین تارڑ اپنی کالم میں بات کرتے ہیں۔ بھوک نہ صرف پاکستانی سماج کا مسئلہ ہے بلکہ یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ دنیا میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جہاں لوگ غربت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن کے پاس کھانے کے لیے اور زندہ رہنے کے لیے مناسب خوراک نہیں ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مسائل کا شکار رہتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کالم "فینسی ڈریس" میں اپنی بیٹی کی زبان سے بھوک جیسے عالمی مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ بھوک پوری دنیا کا مسئلہ ہے ایسے غریب ملک جن کی معیشت بہت کمزور ہے۔ وہاں کے افراد کو روزگار کے مسائل کا سامنا ہے وہ لوگ اپنی ضروریات زندگی کو پورا نہیں کر سکتے۔ دنیا میں تقریباً بیاسی کروڑ کے قریب افراد خوراک کی کمی کا شکار ہیں۔ بین الاقوامی سیاسی کشمکش میں مسلسل جنگیں جن کی وجہ سے ان ممالک کی معیشت کمزوری ہوتی ہے اور وہاں کے افراد مسائل کا شکار ہوتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق ان ممالک میں تیزی سے بڑھتی ہوئی بھوک کی وجہ اُن ممالک کی آبادی میں اضافہ اور ان ممالک کے وسائل میں کمی بھی ہے۔ افریقہ، صومالیہ، یمن میں بھوک کا مسئلہ کافی زیادہ ہے۔ یہ ممالک بھی وسائل کی کمی اور مسلسل خانہ جنگی کا شکار رہے ہیں۔ زمینی مسائل کے ساتھ ساتھ ان خطوں کے موسمی اثرات اور مسلسل قدرتی آفات سے تباہی بھی بھوک جیسے مسائل کا سبب بنتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنے ایک کالم میں اس عالمی مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی عینی کی زبان اس مسئلہ کو عام انداز بیان میں بیان کرتے ہیں:

"ابو اس نے ایک دم میرا کندھا پکڑ لیا مجھے یاد آیا کہ میڈم کہہ رہی تھیں ایتھوپیا کے بچوں کے لیے امداد چاہیے گھر سے پیسے لاؤ۔۔۔ اچھا ابو وہ معصومیت سے کہنے لگی۔ ایتھوپیا کے بچوں کو پیسے اس لیے بھیجنا ہے تاکہ وہ بھی فینسی ڈریس شو میں حصہ لے سکیں۔ ہاں بیٹے وہ

بہت دنوں سے فینسی ڈریس میں حصہ لے رہے ہیں بھوک کے فینسی ڈریس ہیں۔" (۵۲)

عالمی برادری ان غریب عوام کے لیے ریلیف فنڈز ان ممالک میں بھجواتی رہتی ہے مگر ضرورت اس امر کی ہے کہ مضبوط معیشت رکھنے والے ممالک کو انسانیت کی بھلائی کے لیے مزید کام کرنے ہوں گے۔ فلسطین عراق پر امریکی / اسرائیل مظالم اور مسلم خاموشی امریکہ اور اسرائیل کی بڑھتی ہوئی دہشت گردی اور مسلمانوں سے نفرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ کتنے سالوں سے جاری ان جنگوں میں لاکھوں کے حساب سے مسلمانوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ کتنے ہی اپنے گھر میں جو مکمل ملبہ کا ڈھیر بن چکے ہیں۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی باقاعدہ منصوبہ کے تحت نسل کشی کی باری ہے۔ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ مظالم عام ہیں۔

عراق، افغانستان، فلسطین، کشمیر، روینگیا کے علاوہ کتنے ایسے خطے ہیں جہاں مسلمانوں کے ساتھ ناروا سلوک رکھا جاتا ہے۔ اُن کو طرح طرح سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ امریکی اور اسرائیلی جارحیت پر مسلم امہ کی خاموشی سے اس کو مزید تقویت ملتی ہے۔ مسلمہ امہ فرقوں میں بٹ چکی ہے۔ اُن کے اپنے معاشی حالات خراب ہیں۔ امریکہ سے امداد لے کر اپنی معیشت کو سہارا دیتے ہیں اور کچھ مسلمان ممالک جن کی معاشی حالت بہتر ہے وہ اپنے ملکی مفاد کی خاطر اس مسئلہ پر بات نہیں کرتے ہیں۔ صرف مزاحمتی بیان جاری کر دینے سے امریکہ اسرائیل اپنے مظالم سے باز نہیں آتے۔ امریکہ اسرائیل کے ان مظالم کے خلاف ہماری سڑکوں پر جلوس نکالے جاتے ہیں جس میں امریکہ اور اسرائیل کا پرچم نذر آتش کیا جاتا ہے۔ اُن کے خلاف نعرہ بازی ہوتی ہے کیا کبھی نعروں سے اور جھنڈے جلادینے سے ظلم ختم ہوتے ہیں۔ ان کے لیے معیاری اقدامات اٹھانے ضروری ہوتے ہیں مگر امت مسلمہ تو خود ٹکڑوں میں بٹ چکی ہے۔

تمام فرقے اس بات پر لڑ رہے ہیں کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر ہے۔ امت مسلمہ کو فرقہ پرستی میں مبتلا دیکھ کر کفار کی سازش مسلمانوں کی نسل کشی کی صورت میں سامنے آرہی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کمال اسلوب کے ذریعے مسلمان ممالک کے قائدین کی خاموشی کو مکالماتی انداز میں سامنے لاتے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم "فلسطینی کا تماشا" میں لکھتے ہیں:

"وہ کہنے لگی ہاں میں اگر ان کے لیے کچھ کر نہیں سکتی تو ان کا تماشا کیوں دیکھوں اور تھوڑے لوگ ہیں تماشا دیکھنے کے لیے جلوس نکالنے اسرائیل مردہ باد کے نعرے لگانے

اور خلق پھاڑ پھاڑ کر امریکہ کو گالیاں دینے والے پرچم جلانے والے تمہارے یہ مسلمان ملک اور ان کے سربراہ تماشائی نہیں ہیں؟" (۵۳)

مسلم ممالک میں مسلمانوں کے ساتھ اس ظلم پر عرب دنیا کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ ان کی اس خاموشی اور منافقانہ رویے کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جنگ کے آغاز میں عرب دنیا کے حکمرانوں نے اپنے سونے سے بنے ہوئے محل سے بیان دیا تھا کہ سارا قصور حماس اور حزب اللہ کا ہے۔ سعودیوں نے تو ویسے مسلمانی کا حق ادا کر رہا انھوں نے برباد ہو چکے لبنان کے لیے کروڑوں ڈالر کا عطیہ دیا ہے۔ جیسے امریکہ مسلسل اپنے جڑواں بھائی اسرائیل کو میزائل اور راکٹ سپلائی کر رہا ہے۔" (۵۴)

کچھ مسلمان ممالک جن کی معیشت مضبوط ہے۔ ان کے ملک قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں ان کے تعلقات امریکہ اور اسرائیل سے بہتر ہیں۔ ان ممالک کی تجارت کا دار و مدار مضبوط معیشت رکھنے والے مسلمان ممالک کے ساتھ ہے۔ اگر یہ ممالک امت مسلمہ کے درد کو اپنے مفادات پر ترجیح دیں تو امریکہ اسرائیل کو ان کی مسلمان دشمنی سے باز رکھا جاسکتا ہے۔ مگر جن ممالک کے قائدین نے اسلامک بلاک بنانے کی کوشش کی۔ اُن ممالک کے قائدین کو امریکہ نے اپنوں کے ہاتھوں ہی قتل کروایا اور کچھ لوگوں کو دہشت گرد اور قاتل قرار دے کر اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں تختہ دار تک پہنچا کر اس باب کو مکمل طور پر بند کر دیا۔

### مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور کے امتیازات

ایک ادیب جو کہ سماج کا ترجمان ہوتا ہے وہ اپنی تصانیف میں سماج کی نمائندگی کرتا ہے۔ سیاست چونکہ سماج کا ایک اہم جزو ہے لہذا کہیں نا کہیں ایک ادیب اپنے سماج کے سیاسی نظام کا ذکر ضرور کرتا ہے۔ کالم چونکہ صحافت کا ایک ذریعہ ہے اور صحافت اور سیاست کا اس میں گہرا تعلق ہے۔ ایک فرد جو ادیب بھی ہے اور صحافی بھی ہے وہ اپنے نظام سے متاثر ہوتے بغیر یا اس پر بات کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔ یقیناً وہ ان اثرات کو اپنی تحریروں میں سمو کر عوام تک پہنچائے گا۔ مستنصر حسین تارڑ جو ایک ادیب بھی ہیں اور ایک صحافی بھی ہیں۔ وہ سیاسی اتار چڑھاؤ اور اس سے پیدا ہونے والی صورت حال کو اپنی تصانیف میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے کالم میں اکثر ہمارے سیاست کے نشیب و فراز اور اس سے پیدا شدہ اثرات پر بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے سیاست کو براہ راست موضوع نابینا اور ناہی وہ اپنے کالموں میں کسی سیاست دان کا نام لے کر تنقید کرتے ہیں بلکہ اُس سیاسی لیڈر کی پالیسی جس سے مستنصر حسین تارڑ خود اور سماج پر اُس کے اثرات بیان کرتے ہیں جبکہ اکثر کالم نگاروں کے ہاں نام کے ساتھ تنقید یا تعریف کی جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی وابستگی کسی سیاسی جماعت سے دکھائی نہیں دیتی ناہی وہ بے جا تعریفوں کے پل باندھتے دکھائی دیتے ہیں۔ سچ کو سچ اور غلط کو غلط لکھا۔ سیاسی جماعتوں اور اُن کے لیڈران کے اچھے کاموں کی ضرور تعریف کرتے ہیں مگر اُن کے شعور کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ باقی صحافیوں کی طرح ٹی وی چینلز پر بیٹھ کر نواز شریف زندہ باد اور گو عمران گو کے نعرے نہیں لگاتے ہیں بلکہ وہ صرف اُن کاموں کو نمایاں کرتے ہیں جس سے ملک و قوم کی فلاح و بہبود ہوتی ہو۔

مستنصر حسین تارڑ کے بیان کا یہ کمال ہے کہ وہ پورے کالم میں ایک یا دو جملوں میں اپنے بات کا اظہار کر دیتے ہیں جبکہ عطاء الحق قاسمی کے ہاں پورا سیاسی واقعہ کا بیان نظر آتا ہے۔ مثلاً قاسمی اپنے ایک کالم "حور جنت میں کانپ جاتی ہے" میں ضیاء الحق سے ملاقات کا احوال پورے کالم کے اندر بیان کرتے ہیں جیسے وہ کالم کا آغاز یوں بیان کرتے ہیں۔

"جن لوگوں کو صدر ضیا سے ملنے کا اتفاق ہوا۔۔۔ یہ ساری تفصیل ہم نے اس لیے بیان کی۔۔۔ صدر ضیا کو یہ سمجھ سکے کہ اقرار کرنے والے وہ محب الوطن طبقے ہیں جو کسی سیاسی جماعت سے باقاعدہ وابستہ نہیں۔۔۔" (۵۵)

جبکہ مستنصر حسین تارڑ اپنی تحاریر میں کسی اہم سیاسی نکتہ کی جانب توجہ دلا کر کہانی کا رخ کسی اور سمت کی جانب موڑ دیتے ہیں۔ وہ اپنے ایک کالم میں لکھتے ہیں:

"خلیفہ۔ خلفشاری کا خیال ہے کہ دھند میں بٹیر پکڑے جاسکتے ہیں۔۔۔ یہی تو جمہوریت ہوتی ہے خلیفہ۔۔۔ کہ عام شخص جو پٹواری بھی نہیں ہو سکتا عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر وزیر بن جاتے۔۔۔ خلیفہ حسب معمول تم نے بہکی بہکی باتوں سے مجھ بہکا دیا۔۔۔" (۵۶)

مستنصر حسین تارڑ اپنے سیاسی کالموں میں اکثر سیاست دانوں کو جانوروں کے نام سے پکارتے ہیں جیسے الو گدھے وغیرہ کا علامتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ اور اس علامتی انداز کے ذریعے وہ سیاسی کمزوریوں کو نمایاں کرتے ہیں کرپشن کرنے والے حکمرانوں کے لیے وہ مگر مچھ اور سانپ جیسا علامتی لفظ اختیار کرتے ہیں اور اُن کی نااہلیت کو گدھے جیسے لفظ

سے بیان کرتے ہیں جبکہ یہ انداز بیان ہمیں عطاء الحق قاسمی اور ڈاکٹر اشفاق احمد ورک کے ہاں نظر نہیں آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں سیاسی موضوعات میں زیادہ وسعت دکھائی نہیں دیتی ہے جس کا اظہار وہ بہت بار کر چکے ہیں کہ میں سیاست پر براہ راست بات نہیں کرتا اور نامیرا سیاست سے کوئی تعلق ہے۔ البتہ میں سیاست دانوں کے اچھے اور برے کاموں کی تعریف اور تنقید ضرور کرتا ہوں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد ورک تارڑ صاحب کے سیاسی شعور کی انفرادیت کے حوالے سے انٹرویو میں کہتے ہیں:

"مستنصر حسین تارڑ غیر جانبدار آدمی ہیں کسی بھی پارٹی سے اُن کا کوئی تعلق نہیں ہے تارڑ صاحب کے ہاں کوئی طوق نہیں ہے گلے میں وہ کسی کی حمایت محض اپنے ذاتی فائدے کے لیے نہیں کرتے۔" (۵۸)

نواز شریف کی نااہلی کے بعد انھوں نے جوری ایکٹ کیا تھا اس حوالے سے ارشاد بھٹی اور مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہ کالم ایک دو بے کے اتنے قریب ہیں کہ پنجابی کی مشہور ضرب المثل بھی دونوں کالم نگاروں نے استعمال کی ہے۔ ارشاد بھٹی اپنے کالم "کھیڈاں گے ناں کھیڈن دیاں گے" میں لکھتے ہیں:

"ہاں البتہ میاں صاحب پیالی میں طوفان برپا کرنے کی کوششیں کر رہے، وہ سمجھ بیٹھے کہ جمہوریت کا مطلب انکی ذات مبارک، یعنی وہ ہیں تو جمہوریت بھی ہے، وہ نہیں تو جمہوریت بھی نہیں اور نااہلی کے بعد اب تو ان کا گیم پلان یہی کہ "کھیڈاں گے ناں کھیڈن دیاں گے" (۵۸)

مستنصر حسین تارڑ نے اپنا کالم بھی بالکل اسی موضوع پر لکھا ہے۔ نواز شریف نے جب اپنی نااہلی پر ری ایکٹ کیا تو انھوں نے اپنے کالم "نواز شریف ہندوؤں کے بھگوان ہو گئے" میں لکھا ہے:

"یقین کیجیے میاں صاحب۔ ہماری سیاسی تاریخ میں کسی سیاست دان نے عہدہ چھن جانے پر اتنی آہ وزاری نہیں کی۔ نہ ایوب خان نے۔ نہ بھٹو نے۔ اور نہ ہی گیلانی نے۔ سبھی رخصت ہو گئے کہ ان میں عزت نفس تھی..... وہ جو مشہور مثال ہے کہ نہ کھیلیں گے اور

نہ کھیلنے دیں گے کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کا پس منظر کیا ہے؟۔ دیہات میں یعنی پرانے زمانوں کے دیہات میں بچے کوڈیاں اور بنٹے یعنی کانچ کی گولیاں کھیلا کرتے تھے اور اس کھیل کے لیے کچی زمین میں ایک ”کھتی“ کھودی جاتی تھیں۔ اردو میں ”کھتی“ کا مترادف مجھے سوجھ نہیں رہا کہہ لیجیے کہ ایک مختصر گڑھا کھودا جاتا تھا اور کانچ کی گولیاں اس میں لڑھکائی جاتی تھیں اور کسی آپ جیسے بچے کو اس کھیل میں شریک نہیں کیا جاتا تھا تو وہ رات کے وقت چپکے سے اس ”کھتی“ کو سیراب کر دیتا تھا اور کہتا تھا ’نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے تو میاں صاحب آپ نے بھی یہی سیرابی فرمائی کہ اگر میں نااہل ہو کر نہیں کھیلوں گا تو پوری پاکستانی قوم بھی نہیں کھیلے گی۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے“ (۵۹)

درج بالا دو کالم نگاروں کے کالموں کے موضوعات سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات میں کس قدر مماثلت ہے۔ تمام ذاتی مفاد سے بالاتر ہو کر مستنصر حسین تارڑ سیاست پر لکھتے ہیں۔ باقی ادیبوں اور صحافیوں کی طرح وہ بے جاداد کے قائل نہیں ہیں اور نا وہ کسی کے گن گاتے ہیں بلکہ وہ ہر معاملے میں مکمل طور پر غیر جانب داری اختیار کرتے ہیں۔ اسی غیر جانب داری کی وجہ سے اُن کے ہاں سیاسی معاملات میں بہت زیادہ گہرائی دکھائی نہیں دیتی ہے البتہ وہ بدلتے سیاسی منظر نامے کے اثرات کو سماج پر ضرور محسوس کرتے ہیں۔

## حوالہ جات

- ۱۔ مولانا گوہر رحمن، اسلامی سیاست، المنار یک سنٹر، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۶
- ۲۔ سید احمد دہلوی، (مرتبہ) فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ص ۱۴۱
- ۳۔ شان الحق حقی، (مرتبہ) فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء، ص ۶۴۸
- ۴۔ مشرف احمد، راجندر سنگھ بیدی کاسندی مطالعہ، نفیس اکیڈمی کراچی، جنوری ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۵
- ۵۔ رشید امجد (مرتبہ) ڈاکٹر، مزاحمتی ادب اردو، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۷
- ۶۔ محمد نور الامین، مذہب اور مذہبی سیاسی جماعتیں، <http://www.humsub.com.pk>، 19 July، 2022

1:08 PM، 2022

۷۔ ایضاً۔

- ۸۔ امتیاز عالم، انگریزیت مشمولہ روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۲ جون ۲۰۲۲ء
- ۹۔ محمد اکرام چودھری، سائرن، مشمولہ روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۲ جون ۲۰۲۲ء
- ۱۰۔ جمہوری اقدار اور سیاسی قیادت، روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، ۲۲ جون ۲۰۲۲ء
- ۱۱۔ سفیر اعوان، ڈاکٹر، نگری نگری گھومنے والا مسافر، (مضمون)، مشمولہ چہار سو، جلد ۲۶، شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۱۵ء، ص ۳۹

۱۲۔ ایضاً

- ۱۳۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۴۲

۱۴۔ ایضاً

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۳

- ۱۶۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶

۱۷۔ ایضاً، ص ۸-۹

- ۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۳

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۴

- ۲۰۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۳۶

۲۱۔ ایضاً، ص ۷۳

۲۲۔ مستنصر حسین تارڑ، چک چک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۲۵

۲۳۔ صفدر علی خان، سیاسی وفاداریاں تبدیل کرنے کا چلن، <http://www.jasart.com>، 31 July 2022،

3:03 PM

۲۴۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۱-۱۵۰

۲۵۔ ایضاً، کالم یہ خون کی مہک ہے یالب یار کی خوشبو، ص ۳۴۴

۲۶۔ مظہر علی خان لاشاری، ہمارے حکمران اور نے پروٹوکول، <http://www.nawaiwqt.com.pk>، 22 اگست

PM12:07,2022

۲۷۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۹۴

۲۸۔ ایضاً، ص ۹۳

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۳۱

۳۰۔ نیر سرحدی، (پورا سچ)، (کشمیر کا مقدمہ)، روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، اتوار ۳۱ جولائی ۲۰۲۲ء، ص ۱۵

۳۱۔ مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۱۲۹

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۰

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ ریاض سہیل، ۷۰ برس میں بیشتر وقت پاکستان میں آمریت کا سایہ ہی رہا، <http://www.bbc.com>، 11:18

13 August 2022، am

۳۵۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۸۸

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۱۰

۳۸۔ ایضاً

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۱۱

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۳

- ۴۱۔ ایضاً، ص ۷۵
- ۴۲۔ ایضاً
- ۴۳۔ ایضاً
- ۴۴۔ ایضاً، ص ۷۲
- ۴۵۔ ایضاً
- ۴۶۔ ایضاً
- ۴۷۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۲، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۹
- ۴۸۔ ایضاً، ص ۹۲
- ۴۹۔ ایضاً، ص ۹۲-۹۳
- ۵۰۔ مستنصر حسین تارڑ، چک چک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۱۱
- ۵۱۔ ایضاً
- ۵۲۔ مستنصر حسین تارڑ، الو ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص ۱۵
- ۵۳۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۸۲
- ۵۴۔ ایضاً
- ۵۵۔ عطا الحق قاسمی، جرم ظریفی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۱۴۷-۱۴۸
- ۵۶۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۱
- ۵۷۔ اشفاق احمد ورک، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۲ بجے دن
- ۵۸۔ ارشاد بھٹی، کھیڈاں گے ناں کھیڈن دیاں گے، (کالم) مشمولہ روزنامہ جنگ، ۳۱ اگست ۲۰۱۷ء۔
- ۵۹۔ مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۵

کالم نگاری اردو صحافت کا ایک معتبر ذریعہ ہے۔ اردو کالم نگاری کی ابتدا برصغیر سے ہوئی۔ ابتدا میں یہ کالم بھی ایک خبر ہی شمار کیے جاتے تھے مگر آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ کالموں میں بہت سی تبدیلی آئی گئی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب صحافت کو برصغیر میں انگریزوں کی جانب بہت سی پابندیوں کا سامنا تھا۔ جب اپنی بات کے کھل کے اظہار کرنے پر پابندی لگادی گئی تھی تب برصغیر کے نامور ادیبوں اور صحافیوں نے اپنی بات عوام اور حکومت وقت تک پہنچانے کے لیے فکاہی طریقہ کار اختیار کر لیا۔ اس طریقہ کار کو اپنا کر وہ حکومت وقت کے غلط فیصلوں، انگریزوں کے ظلم و ستم پر طنز و مزاح کی آمیزش کے ساتھ تنقید کرنے لگے۔ اپنی رائے اور تجزیے کو عوام تک پہنچانے کے لیے صحافیوں اور ادیبوں نے فکاہیہ انداز اختیار کیا اور یوں کالم نگاری کا آغاز ہوا۔ ابتدا میں کالموں کے لیے اخبارات میں صفحات مختص نہیں تھے مگر وقت بدلنے کے ساتھ صحافت میں بھی جدت پیدا ہونا شروع ہو گئی جس کی بدولت اخبارات میں کالم نگاری کے لیے مخصوص صفحات کا تعین ہو گیا۔ بدلتے وقت کے ساتھ خبر کی ہئیت اور کالم نگاری کی ہئیت میں تبدیلی نے جنم لیا اور اس کو مد نظر رکھتے ہوئے کالم نگاروں نے کالموں کے سلسلے کو آگے بڑھانا شروع کر دیا۔

جدید دور میں کالموں کی مختلف اقسام موجود ہیں روزانہ کے اخبارات میں مختلف قسم کے کالم شائع ہوتے ہیں اور کالم نگاروں نے سماج سے تعلق رکھنے والے ہر عنصر کو اپنی کالم نگاری میں شامل کیا۔ دور جدید میں اردو کالم بہت تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے اور اس کو لکھنے والوں کی تعداد میں بھی دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کالم بھی باقاعدہ مختلف اخبارات میں لکھے جا رہے ہیں۔ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ادیب اور لکھاری افسانہ، ناول، سفر نامہ، خاکہ نگاری، شاعری کے ساتھ ساتھ کچھ ادیب صحافت میں عوام کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ انھی ادیبوں میں سے ایک نام مستنصر حسین تارڑ کا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ دور جدید کے ادیبوں میں سب سے منفرد اور بڑا نام ہے۔ تارڑ صاحب نے اردو ادب کے ساتھ صحافت کے شعبے میں بھی اپنی کالم نگاری کے ذریعے زبردست اضافہ کیا۔ مستنصر حسین تارڑ نے ادبی تصانیف سفر نامہ، ناول نگاری، ڈرامہ اور افسانہ نگاری میں اپنا قلم آزمایا اور بہت زیادہ کامیابی سمیٹی۔ آپ نے مختلف اخبارات میں تقریباً

۱۹۸۰ء سے لکھنا شروع کیا اور آج ۲۰۲۲ء تک وہ مسلسل کالم نگاری کر رہے ہیں۔ اخبار جہاں میں ہر ہفتہ کاروان سرانے کے نام سے جنگ میگزین میں کالم آتا ہے۔

اس کے علاوہ دنیا نیوز اور ۹۲ نیوز میں بھی مستنصر حسین تارڑ نے کالم لکھے۔ اس کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے انگریزی کالم ایک انگریزی اخبار The Dawn میں لکھتے رہے ہیں۔ ان کے کالماتی مجموعے بھی سنگ میل پہلی کیشنز لاہور کی جانب سے وقفہ وقفہ سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان کے اب تک شائع ہونے والے مجموعوں میں کاروان سرانے، چک چک، الو ہمارے بھائی ہیں، گدھے ہمارے بھائی ہیں، بے عزتی خراب، شتر مرغ ریاست، گزارہ نہیں ہوتا، مزاروں میں خواہشیں، تارڑ نامہ ۱، تارڑ نامہ ۲، تارڑ نامہ ۳، تارڑ نامہ ۴، تارڑ نامہ ۵، تارڑ نامہ ۶ اور ۲۰۲۰ء میں ان کا سامنے آنے والا کالموں کا مجموعہ تارڑ نامہ ۷ ہے۔ ان مجموعوں کے علاوہ مستنصر حسین تارڑ نے بہت سے سفر نامے بھی لکھے جن کی تعداد ۳۱ کے قریب بنتی ہے جبکہ دونولٹ، دو افسانوں کے مجموعے اور تین کتابیں خاکے اور گیارہ ناول بھی تارڑ صاحب کے شائع ہو چکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ علم کا ایک دریا ہے ہر کوئی اپنی خواہش کے مطابق اور ضرورت کے مطابق ان سے استفادہ کرتا ہے۔

کالم نگاری میں مختلف اقسام پائی جاتی ہیں مثلاً کھیلوں کے کالم میں کھیلوں سے متعلق خبریں ہوں گی اور اس پر کالم نگاروں کی رائے ہوگی بالکل اسی طرح طب کے کالموں میں بیماریوں وغیرہ کا تذکرہ ہوگا اور ان سے متعلقہ علاج کے لیے مختلف تجاویز کو پیش کیا جائے گا۔ فکاہیہ کالم اور مزاحیہ کالم میں کالم نگاروں نے طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ اپنی تجاویز پیش کی ہوں گی۔ سنجیدہ کالم نگاری میں کالم نگاروں نے سماج سے متعلقہ کوئی نہ کوئی عنصر موضوع بحث لایا ہوتا ہے۔ علامتی کالم نگاری میں کالم نگار کسی نہ کسی علامت کا استعمال کر کے اپنے قارئین کی توجہ کسی سنجیدہ نوعیت کے مسئلے کی طرف دلانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

عموماً کالم نگار یہ انداز مارشل لاء، آمریت کے دور میں اپناتے ہیں کیونکہ اس دور میں صحافت کو بہت سے پابندیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور شخصی آزادی اظہار پر پابندی ہوتی ہے۔ شہر نمایاڈاری نما کالم میں کسی شہر میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں بیان ملتا ہے اور اس قسم کے کالم میں بھی کسی بھی سماجی عنصر کو موضوع بحث بنالیا جاتا ہے۔ سفر نامہ یا سیاسی کالم میں کسی بھی سفر یا تفریح کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کالم نگاری کی اس قسم کو اپناتے ہوئے بہت سے کالم اپنی سفری روداد پر لکھے ہیں جن میں اندرون ملک اور بیرون ملک

کے حالات و واقعات کو شامل کیا گیا ہے۔ قانونی کالم میں کالم نگار قانون سے متعلقہ کالم لکھتا ہے۔ قانونی پیچیدگیوں اور قانونی مسائل کو وہ اپنے کالموں میں جگہ دیتا ہے۔ کالموں کی ایک قسم دینی کالموں کی بھی ہوتی ہے۔ کالم نگاری کے اس حصے میں علماء کرام، مفتی، مذہبی اسکالر، مذہبی نوعیت کے کالم لکھتے ہیں۔ مذہب کے متعلق لوگوں میں شعور اور آگاہی پیدا کرتے ہیں۔ معاشی اور نفسیاتی کالم میں انسان کے معاشی حالات، معاشی مسائل، ملک کی معاشی صورت حال اور نفسیاتی کالم میں انسانی دماغ کی صحت اور اس سے متعلقہ مسائل موضوع بحث بنتے ہیں۔ کالم نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں بہت سے اردو اخبارات نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ کالم ۱۸۵۷ء سے پہلے بھی کسی نا کسی صورت میں اخبارات کا حصہ بنتا رہتا تھا۔

اردو کا پہلا اخبار جام جہاں نما، اودھ پنچ کالم نگاری کے آغاز کے بنیادی مآخذ سمجھے جاتے ہیں اور مختلف مفکرین اس بات پر متفق بھی ہیں۔ ان دو اخباروں کے علاوہ سرسید کا جاری کردہ رسالہ تہذیب اخلاق مولانا عبدالسلام آزاد کا اخبار الہلال، ہمدرد، زمیندار، ستارہ، صبح، کے اردو کالم نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اردو کے ممتاز صحافیوں میں سرسید، مولانا ابوالکلام آزاد، شوکت تھانوی، چراغ حسن حسرت، مولانا ظفر علی خان، عبدالمجید سالک، مجید لاہوری، ابو ظفر ناش، حمید نظامی اور عبدالمجید آبادی شامل ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی بہت سے کالم نگار صحافی صحافت کے میدان میں شامل ہوئے جنہوں نے اردو کالم نگاری کو عروج بخشا۔ قیام پاکستان کے بعد جاری اخبارات میں نوائے وقت، روزنامہ آزاد، روزنامہ احسان، روزنامہ انقلاب، روزنامہ زمیندار، روزنامہ مساوات، روزنامہ مشرق، ندائے ملت، اخبارات شامل ہیں۔ ان میں لکھنے والوں میں مجید لاہوری، علامہ لطیف، مجید نظامی، ظہیر کاشمیری، مولانا چراغ حسن حسرت، محمد شفیع، عنایت اللہ، وقار انبالوی، مجیب الرحمن شامی، ارشاد احمد خان، نذیر ناجی، منیر احمد منیر، عبدالقادر حسن اور دوسرے نامور کافی حضرات شامل ہیں۔

شعور کسی بھی چیز کے بارے میں کے بارے میں آگاہی کو کہتے ہیں۔ جب ایک ادیب اپنا قلم اٹھائے گا تو لازمی اپنے معاشرے کی ادب میں عکاسی کریں گا۔ اُس کی تحریروں سے معاشرتی رنگ جھلکتا ہوا نظر آئے گا۔ اُس کی تحریروں میں ہمیں جابجا اُس کے معاشرے کی نمائندگی ملے گی۔ سیاست کسی بھی سماج کا ایک اہم رکن ہے۔ افراد اور سیاست کے درمیان بات کرنا، حکومتوں کا قیام سیاسی قائدین اور اُن کی سیاسی جماعتوں کے رویے عوام کا ملکی سیاست میں کردار اور سیاسی حالات و واقعات سے آگاہی الیکشن کے عمل اور ووٹوں کا استعمال سیاسی

قائدین کی جانب سے عوام کو سیاسی ریلیف اُن کے مسائل کو سننا اُس کا حل بتانا اور اُن مسائل کا خاتمہ سیاسی شعور میں آتا ہے۔ ایک ادیب جب اپنی تحریر میں ان کا ذکر کرتا ہے تو وہ دراصل اپنے سیاسی شعور کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ سیاست اور ادب کا گہرا تعلق ہے۔ کوئی بھی ادب خواہ وہ کسی بھی دور کا ہو وہ مکمل طور پر اپنے سماج کی نمائندگی کر رہا ہوتا ہے۔ اردو ادب میں اسے بہت سے مفکر گزرے ہیں جن کی تحریروں میں ہمیں اُن کے دور کے سیاسی حالات واقعات دکھائی دیتے ہیں۔ منٹو، فیض احمد فیض، غالب، مولانا الطاف حسین حالی، حبیب جالب اور دوسرے ادباء اور شعراء نے اپنی اپنی تحریروں میں سیاست اور اپنے دور کے سیاسی حالات واقعات کو بیان کیا ہے۔ یوں ادب اور سیاست کا تعلق واضح ہوتا ہے۔ ادب اور سماجی شعور کا تعلق بھی آپس میں بہت گہرا ہے۔ دنیا کا کوئی بھی ادب اپنے سماج سے کٹ ہی نہیں سکتا ہے اگر دنیا کے کسی ادب کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں اُن کے ادب میں اُن کے عہد اور گزرا ہوا عہد دکھائی دیتا ہے گویا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادب گزشتہ ادوار کو محفوظ کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ انسان اور معاشرہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم میں سماج کے اندر ایسا کوئی پہلو باقی نہ رہا ہو گا جو ادب کے اندر موضوع بحث نہ بنا ہو گا۔ جب کوئی ادیب اپنی تحریروں میں سماج سے متعلق بات کرتا ہے تاکہ قارئین کی توجہ کسی نہ کسی سماجی مسئلہ کی طرف موڑی جائے۔ سماج کے کسی پہلو کو اجاگر کیا جائے جو آج تک مخفی رہا ہو۔ ایک ادیب اور لکھاری جب اپنی تحریروں میں سماج کی بات کرتا ہے یا کسی بھی سماجی عنصر کو اپنی تحریروں میں پیش کر رہا ہوتا ہے تو دراصل وہ اپنے سماجی شعور کا اظہار ہی کر رہا ہوتا ہے۔ سماجی شعور سے مراد سماج سے متعلقہ عناصر کی بابت آگاہی واقفیت ہے۔ مزید برآں کسی خاص دور میں تہذیبی علمی، معاشرتی اور فکری سطح پر واقع ہونے والے واقعات سے اور افکار سے آگاہی ہے۔ ادیب اور سماج کا تعلق بہت گہرا ہوتا ہے۔

دنیا کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ انسان اور سماج کا وجود ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے اور سماج کے بغیر انسانی شخصیت کی تکمیل ناممکن ہے۔ انسان اپنے معاشرے کے حالات واقعات سے ہی اپنا شعور کو پروان چڑھاتا ہے یا یوں بھی کہا جاتا ہے کہ کسی بھی انسان کا شعور بنا بنایا نہیں ہوتا بلکہ معاشرہ انسان کے شعور کو بناتا ہے اور اُس کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ادیب چونکہ سماج کا اہم فرد ہوتا ہے۔ اس کی تحریروں میں ہمیں سماج کی جھلکیاں جا بجا نظر آتی ہیں۔ وہ اپنے سماج کے اتار چڑھاؤ کو محسوس کرتا ہے اور سماجی ناہمواریوں کو اپنی تخلیقات میں نمایاں کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے پاکستانی سماج کی

نمائندگی کی ہے۔ پاکستانی سماج کی مکمل تصویر ہمیں مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں دکھائی دیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سماج کے ہر ایک پہلو کو اپنی تحریروں میں سمو کر اپنے گہرا سماجی شعور کا عمدہ مظاہرہ کیا ہے۔ وہ سماج کی باریک بینیوں سے اچھی طرح واقف نظر آتے ہیں۔ اُن کے کالموں کے موضوعات سے ایسا معلومات ہوتا ہے کہ مستنصر پاکستانی سماج میں بسنے والے ہر گھر میں گئے ہوں اور ان گھروں اور افراد کی کہانیوں کو اپنی ضبط تحریر میں لا یا ہوں۔ مستنصر حسین تارڑ نے معاشرتی رویوں کی عکاسی کی ہے وہ رویے جن کا سامنے ہر فرد کو کرنا پڑتا ہے۔ دو قسم کے رویے ہمیں مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں دکھائی دیتے ہیں مثبت اور منفی۔ چونکہ منفی رویے سماج کو ناہموار کرتے ہیں اور ایک سچے اور اصل ادیب کی یہ پہچان ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں سماج کی ناہمواریوں کا تذکرہ کریں اور لوگوں کی توجہ اس جانب دلائے مستنصر حسین تارڑ جو ایک سچے اور کھرے ادیب اور صحافی ہیں انھوں نے سماج کے مثبت پہلو کے ساتھ ساتھ منفی پہلوؤں کی بھی درست انداز میں تصویر کشی ہے اور لوگوں کی توجہ اس جانب دلوائی ہے۔ منفی رویے ہمارے سماج پر بہت بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے ہماری قوم کے لاپرواہی پر مبنی مزاج کی نشاندہی کی ہے کہ بحیثیت قوم ہم کسی مسئلہ کو سنجیدہ نہیں لیتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارے مسائل میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے۔ منافقت ہمارے سماج کے لوگوں کا ایک بڑا مسئلہ ہے۔ دو روپ رکھنے والے یہ لوگ سماج کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوئے ہیں۔ تساہل پسندی بد قسمتی سے ہمارے مزاج کا حصہ بن چکی ہے اپنے فرائض کو بھول کر سماج کے زوال میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ معاشرتی بے حسی خود غرضی، بے ایمانی، اپنے رویوں میں لاکر ہم انسانیت کے مرتبہ سے نیچے آتے جا رہے ہیں۔

انسانی رویوں کو نمایاں کر کے مستنصر حسین تارڑ نے پاکستانی سماج میں درپیش مسائل کو بیان کیا ہے۔ ان مسائل میں بد عنوانی، قانون کا دہر ا معیار، دہشت گردی، مغرب پرستی، غربت گداگری، صفائی کی صورت حال، امتیازی سلوک پر لکھا۔ اس کے علاوہ مذہب اور مذہبی انتہا پسندی دکھاوا اور معدوم ہوتی اخلاقی اقدار کو نمایاں کیا ہے۔ سماجی شعور کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے شعوری امتیاز کو نمایاں کیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ساتھ باقی ادیبوں کے موضوعات پیشکش کی طریقہ کار میں فرق کو نمایاں کیا۔

مقالے کا تیسرا باب مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور پر مشتمل ہے۔ سیاست اور سماج کا گہرا تعلق ہے۔ سیاست سماج کا ایک فرد ہے اس کے بغیر کسی بھی سماج کا نظم و نسق اور نظام زندگی کا تصور ناممکن ہے۔

ہر دور میں حاکم اور محکوم کی موجودگی اس بات کی گواہی دیتی ہے۔ سیاست کے تعارف و مفہوم کے بعد سیاست اور ادب کے تعلق کو بیان کیا گیا ہے۔ ہر دور میں سیاست اور ادب کا چولی دامن جیسا ساتھ رہا ہے۔ سیاست ادب کو براہ راست متاثر کرتی ہے۔ اگر کسی بھی دور کے بارے میں درست معلومات لینی ہو تو اس دور کے ادب کو دیکھا اور پرکھا جائے۔ کوئی بھی ادیب اپنے دور کی سیاسی فضا سے متاثر ہوتے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سیاسی منظر نامہ سے متاثر ہو کر کوئی تخلیق سامنے لاتا ہے تو وہاں سیاست اور ادب دونوں ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ ادب اور سیاست کے تعلق کی وضاحت کے بعد پاکستان کے سیاسی حالات کو بیان کیا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۲۲ء تک کے حالات میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی۔ نئے نئے مسائل پہلے سے زیادہ شدت اختیار کر کے ہمارے سماج میں پھیل چکے ہیں۔ روز اول کی طرح سیاسی ناہمواریاں، سیاسی چپقلش، لاقانونیت، لڑکھڑاتی معیشت، سیاست دانوں کی کرپشن، ذاتی مفاد کو ملکی مفاد پر ترجیح دینا، کٹھ پتلی حکومتوں کا اقتدار میں آنا اس ملک کو کبھی مضبوطی، خوش حالی اور استحکام کی طرف نہیں جانے دیا۔ بیرونی قوتوں کا دباؤ قرضوں کا بوجھ، ملک کی خارجہ پالیسی کو ہمیشہ سے ہی متاثر کرتا رہا۔ اداروں کی ایک دوسرے کے معاملات میں مداخلت ملک کی مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے قوم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے دیا۔ مذہبی جماعتوں نے مذہب کے استحکام کے لیے کوشش نہیں کی بلکہ اپنے ذاتی مفاد کو زیادہ ترجیح دی ہے۔ جس کی وجہ سے ملک میں فرقہ واریت نے جنم لیا۔ سیاسی مذہبی جماعتوں نے محض اپنے مفاد کے لیے کام کیا اور عوام کو نظر انداز کر دیا۔ الیکشن کے دنوں میں وہ ضرور عوام سے وعدہ کرتی۔ پاکستان کے سیاسی حالات کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں موجود شعور کو تفصیل سے بیان کیا اور ان عناصر کی نشان دہی کی گئی جن کی موجودگی ہمیں مستنصر حسین تارڑ کی کالم نگاری میں نظر آتی ہے۔ سیاسی خرابیوں اور ان کے ذمہ داروں کو مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری میں نمایاں کیا۔ دور جدید کے سب سے نمایاں ادیب ہیں انھوں نے باقی شعبوں کی طرح صحافت کے شعبے میں بھی کثیر سرمائے کا اضافہ کیا جس طرح تارڑ صاحب نے پاکستانی سماج میں موجود برائیوں کی نشان دہی کی بالکل اس طرح انھوں نے اپنے کالموں میں پاکستانی سیاست کی کوتاہیوں کو بھی بے نقاب کیا۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کالموں میں جہاں سماج کے منفی پہلوؤں کو بیان کیے ہیں اور سماج میں موجود مسائل منفرد انداز میں نشان دہی کی ہے۔ وہی ہمارے سماج میں موجود مثبت پہلوؤں کا ذکر بھی کیا ہے۔

سفری کالموں کے ذریعے انھوں نے سماجی علاقے جات خوبصورتی اور وہاں کی ثقافت کو خوب نمایاں کیا۔ وہاں کے مہمان نواز لوگوں کے رویوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ صوبہ بلوچستان کے لوگوں کی محب الوطنی اور اپنی ثقافت سے وابستگی کو وہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنے کالموں میں پاکستان فلم انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے فنکاروں کی محنت اور ان کے کواجاگر کیا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے پاکستانی سماج کی خوب صورت رسم و رواج کے بارے میں اپنے اکثر میں لکھا ہے۔ عید کے تہوار پر سب کا ایک ساتھ عید منانا اخوت اور بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے اور اخوت اور پیار کا یہ مظاہرہ دنیا میں زیادہ مضبوطی سے دکھائی دیتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری میں پاکستانی سیاسی نظام کی کمزوریوں کو اجاگر کیا حکمرانوں کی انسان دشمن اور سماج دشمن پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا وہیں سیاست دانوں کے اچھے کاموں کی تعریف بھی کی ہے۔ وہ جمہوریت اور آمریت کی کشمکش کو بیان کرتے ہیں کیونکہ ہمارے پاکستانی سماج ایک عرصہ تک آمریت کے زیر اثر رہا۔ آمروں کے غلط فیصلوں کی مستنصر حسین تارڑ نے ڈٹ کر مخالفت کی ان کے قلم اور انداز میں بے باکی نظر آتی ہے اور آمریت کے خلاف ان کا نقطہ نظر واضح ہے۔

اداروں میں موجود کرپشن کو نمایاں کیا اور ان اداروں میں بے ایمان ضمیر فروش افراد کی حرکات پر کڑی تنقید کی جن کی وجہ سے ارادے مضبوط ہونے کے بجائے زوال کی طرف جارہے ہیں۔ نااہل سیاست دانوں جن کی بدولت سیاسی طور پر کبھی استحکام نہ آسکا۔ ان کی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ علامتی انداز کے استعمال سے مستنصر حسین تارڑ ان کے لیے گدھے جیسے لفظ استعمال کرتے ہیں جس سے ان کے غم و غصہ کا اظہار ہوتا ہے۔ ایک محب وطن انسان اور ادیب کا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔ سیاست دانوں کی غیر قانونی سرگرمیاں بیوروکریسی اور سیاست دانوں کی کرپشن اور اس کے سماج پر اثرات حکمرانوں کے ناجائز اخراجات اور شاہانہ پروٹوکول جس کی وجہ سے ملکی خزانہ پر بوجھ پڑتا ہے اور معیشت مزید کمزوری کی جانب جاتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سخت الفاظ میں ان رویوں پر تنقید کی ہے۔ سیاست دانوں کی باہمی چپقلش عالمی مسائل پر بھی مستنصر حسین تارڑ نے قلم اٹھایا اور اپنی کالم نگاری میں بیان کیا۔ مستنصر حسین تارڑ کی شعوری امتیاز پر بھی مختصر بحث کی گئی ہے اور ان شعوری عناصر کی نشان دہی کی گئی۔ جن کی بنیاد پر مستنصر حسین تارڑ کو دیگر ہم عصر ادیبوں پر امتیاز حاصل ہے۔

## نتائج

مجوزہ تحقیق کی درج بالا بحث سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں۔

۱۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری کے ذریعے سیاسی اور سماجی حالات کی منظر کشی کی ہے۔ جیسے جیسے پاکستانی سماج کے حالات و واقعات بدلتے گئے۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کے موضوعات بھی بدلتے رہے ہیں اور ان بدلتے ہوئے موضوعات کے ذریعے تارڑ صاحب کا شعوری ارتقاء سامنا آتا رہا۔ ابتدا سے لے کر آج تک سماج دشمن عناصر کے خلاف ان کے رویہ میں کوئی لچک نہیں آرہی۔

۲۔ پاکستانی سماج میں سیاسی اور سماجی منظر نامہ بدلنا آئے روز پاکستانی سیاست میں شکم پرست افراد کا اعلیٰ عہدوں پر تقرری، وزیروں مشیروں کی فوجیں، قومی اثاثہ جات کی پامالی، سیاسی جماعتوں کی باہمی چپقلش، اقتدار کی کھینچ تانی، نسل در نسل اقتدار کی منتقلی، امداد کا حصول، حکمرانوں کی خود غرضیاں، ملکی عزت و وقار کا مجروح، ملکی سلامتی کو خطرہ، دیگر ممالک کے ساتھ پاکستان کے تعلقات، اقوام عالم میں پاکستان کا مقام، جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

۳۔ پاکستان کی سیاست کے ساتھ ساتھ سماج کے اندر موجود برائیوں اور ان کے ذمہ داران کو بڑے بے باک انداز سے نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ سخت الفاظ میں ان پر کڑی تنقید کی ہے۔ جس سے مستنصر حسین تارڑ کا شعور سامنے آتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری میں نہ صرف پاکستانی سماج کی عکاسی کی ہے بلکہ بین الاقوامی سماج کو بھی اپنے سفری کالموں کے ذریعے سامنے لایا ہے۔

۴۔ مستنصر حسین تارڑ کے شعوری امتیاز اس وقت سامنے آتا ہے جب کہانی میں اپنی زبان کی بجائے مدعا اپنے کرداروں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں اور انھی کی زبان سے سماج میں موجود مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ مختصر انداز میں کسی اہم نکتے کی طرف اشارہ کر کے بات کا رخ کسی اور جانب موڑ دیتے ہیں۔ بعض اوقات کالم نگار کسی ایک موضوع پر نقطہ نظر پیش کرتا ہے مگر مستنصر حسین تارڑ کے ایک کالم میں ایک سے زیادہ موضوعات پر ان کا نقطہ نظر سامنا آتا ہے۔

۵۔ غیر جانبداری اور بے باک انداز بیان مستنصر حسین تارڑ کی خاصیت ہے اور یہ انداز بیان ان کی کالم نگاری کو ہم عصر کالم نگاروں سے منفرد بناتا ہے۔ کسی بھی مسئلے پر ابتدا سے لے کر آج تک تارڑ نے دو ٹوک انداز میں بات کی ہے۔ آمریت جس نے پاکستان کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا بغیر کسی ڈر اور خوف کے تارڑ صاحب نے آمروں پر تنقید کی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے ذمہ داران جرنیل ہوں یا امریکی جہادی مہم، مستنصر حسین تارڑ نے سماج اور انسانیت کی بربادی کے ذمہ داران جرنیلوں کو ان کا نام لے کر کڑی تنقید کا نشانہ بنایا۔

۶۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی کالم نگاری نہ صرف پاکستانی سماج کے مسائل کو موضوع بحث بنایا بلکہ بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کو درپیش مسائل کا توازن کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ دہشت گردی، اہل مغرب کا پاکستان کے ساتھ رویہ، یورپین معاشرے میں ایک مسلمان یا پاکستان کے مقام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کی خاصیت ہے۔

## سفارشات

نتائج اور درج بالا بحث کی روشنی میں درج ذیل سفارشات کی جاتی ہیں۔

- ۱۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں تاریخی شعور پر کام ہو سکتا ہے۔
- ۲۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں فور گر اوئنڈنگ کے تحت لسانی تجزیہ بھی کیا جاسکتا ہے۔
- ۳۔ مستنصر حسین تارڑ کا دیگر ہم عصر کالم نگاروں سے تقابل پر بھی کام کیا جاسکتا ہے۔
- ۴۔ مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں شمالی علاقہ جات کی ثقافت کا بھرپور تذکرہ ملتا ہے ان کے کالموں میں اس حوالے سے بھی تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔

## کتابیات

### بنیادی ماخذ

- مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۲، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۳، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۴، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۵، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ، جلد ۶، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، تارڑ نامہ ۷، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، چک چک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، کاروان سرائے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، گدھے ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء۔  
 مستنصر حسین تارڑ، الو ہمارے بھائی ہیں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۷ء۔

### ثانوی ماخذ

- القرآن، البقرہ، النساء  
 احتشام حسین، سید، تنقید اور عملی تنقید، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء  
 ارسطو، سیاسیات ارسطو، مترجم، سید نذیر نیازی، عکس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء  
 افتخار کھوکھر، محمد، تاریخ صحافت، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء  
 افضال بٹ، اردو ناول میں سماجی شعور، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء  
 ایم آر شاہد، لاہور کے اہل قلم کا تذکرہ، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء  
 رشید امجد (مرتبہ) ڈاکٹر، مزار حتمی ادب اردو، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء

- سرفراز شاہد، کالم کلام، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء۔
- سید عبداللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔
- شفیق جالندھری، ڈاکٹر، صحافت اور ابلاغ، اے۔ ون پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء۔
- عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، فن صحافت، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۸ء۔
- عطا الحق قاسمی، جرم ظریفی، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء۔
- غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، مستنصر حسین تارڑ، شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء۔
- فرزانہ سید، نقوش ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء۔
- محمد اسلم ڈوگر، بحر کالم اور تبصرہ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔
- محمود الحسن (مرتب)، کشاف اصطلاحات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء۔
- مشرف احمد، راجندر سنگ بیدی کاسندی مطالعہ، نفیس اکیڈمی کراچی، جنوری ۱۹۸۸ء۔
- مولانا گوہر رحمن، اسلامی سیاست، المنار یک سنٹر، لاہور، ۱۹۸۷ء۔
- ولیم ایل میکار، بحوالہ فیچر کالم اور تبصرہ، محمد اسلم ڈوگر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔

## انگریزی کتب

English to English and Urdu Dictionary, Feroz sons, Lahore, 1987

## مقالات

- احمد اقبال، مستنصر حسین تارڑ کے شمالی علاقہ جات کے سفر ناموں کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، اردو، جامعہ پشاور، ۲۰۱۵-۲۰۱۴ء۔
- عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر، صحافت پاک و ہند میں نثر، پاکستان میں اردو کالم نگاری، مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)، نمل، یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء۔
- قراۃ العین اعظم، حمید شاہین کی شاعری میں سماجی شعور، مقالہ برائے ایم فل اردو، نمل اسلام آباد، ۲۰۱۹ء۔

## لغات

اردو لغت (تاریخی اصول پر) جلد از دہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، سن  
جمیل جالبی، ڈاکٹر، (مرتب)، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۲ء  
سید احمد دہلوی، (مرتب) فرہنگ آصفیہ، اردو سائنس بورڈ، لاہور  
شان الحق حق (مرتب)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء  
شان الحق حق (مرتب)، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۰ء  
وارث سرہندی، علمی اردو لغت، علمی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

## رسائل و جرائد

روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، ۲۲ جون ۲۰۲۲ء  
روزنامہ ایکسپریس، اسلام آباد، اتوار ۳۱ جولائی ۲۰۲۲ء۔  
روزنامہ دنیا، اسلام آباد، ۲۱ دسمبر ۲۰۱۹ء  
روزنامہ نوائے وقت، اسلام آباد، ۱۱ مارچ ۲۰۱۸ء  
روزنامہ نوائے وقت، راولپنڈی، ۲۲ جون ۲۰۲۲ء  
سہ ماہی چہار سو، جلد ۲۶، شمارہ مارچ، اپریل ۲۰۱۵ء  
روزنامہ جنگ، ۳۱ اگست ۲۰۱۷ء۔  
روزنامہ جنگ، ۴ جنوری ۲۰۲۲ء۔

## انٹرویو

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، بہ وقت ۱۲ بجے دن  
غفور شاہ قاسم، ڈاکٹر، (انٹرویو) از ثناء ملک، لاہور، ۱۱ اگست ۲۰۲۲ء، ۱۰ بجے دن

## ویب گاہیں

[www.bbc.com](http://www.bbc.com)

[www.humsub.com.pk](http://www.humsub.com.pk)

[www.jasart.com](http://www.jasart.com)

[www.mimirbook.com](http://www.mimirbook.com)

[www.nawaiwqt.com.pk](http://www.nawaiwqt.com.pk)

[www.ncpulblog.blogspot.com](http://www.ncpulblog.blogspot.com)

[www.oxforddictionaries.com](http://www.oxforddictionaries.com)

[www.ur.m.wikipedia.org](http://www.ur.m.wikipedia.org)

[www.urdunews.agency](http://www.urdunews.agency)

## ضمیمہ - ۱

مقالہ ایم فل (اردو)

عنوان: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

محقق: ثناء ملک

انٹرویو: مستنصر حسین تارڑ

### سوالات:

آپ کی رائے میں

سوال 1: اپنے ادبی سفر کے بارے میں بتائیے؟

جواب: میرا ادبی سفر بڑا طویل ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے پچاس سال درکار ہیں۔ نہ تمہارے پاس پچاس سال ہیں اور نہ ہی اب میرے پاس پچاس سال ہیں۔ وہ آپ میری تحریروں میں پڑھ سکتے ہیں۔ وہاں محفوظ ہو چکا ہے۔ میں بنیادی طور پر ایک ریڈر رہا ہوں اور میں نے بے تحاشا پڑھا ہے۔ مجھے پڑھنے میں بہت لطف آتا ہے اور میں نے نویں دسویں تک سارا اردو لٹریچر پڑھ لیا تھا۔ دو تین لائبریریوں کے مالک دور سے مجھے دیکھ کر کہتے تھے کہ نئی کتاب کوئی نہیں آئی۔ جیسے بیل کو چارہ چاہیے ویسے مجھے پڑھنے کے لیے کتاب چاہیے بے شک وہ کتاب کسی کی بھی ہو۔

سوال 2: کس ادیب نے متاثر کیا؟

جواب: میں متاثر نہیں ہوتا، لیکن جن کی اثر انگیزی مجھ پر ہوئی ان میں سرفہرست شفیق الرحمن ہیں۔ اس کے بعد جنگ آمد کو اردو مزاح کی سب سے بڑی کتاب سمجھتا ہوں۔ ہر اچھی کتاب سے متاثر ہوتا ہوں لیکن میں ادیب سے متاثر نہیں ہوتا۔ میں نے بہت سے گمنام لوگوں کو پڑھا ہے اور مجھے پسند بھی آئے ہیں کہیں لوگوں کے مجھے نام بھی یاد نہیں ہیں لیکن ”نکلے تیری تلاش کے بارے میں“ میں نے یہ کہا تھا کہ شفیق الرحمان کی برساتی اس کی شان ہے۔

سوال 3: کالم، ناول، سفرنامہ میں کون سی مرعوب صنف ہے؟

جواب: جس لمحہ میں کام کر رہا ہوں وہی میری پسندیدہ صنف ہے۔ اس پر میں اتنی ہی محنت کرتا ہوں جتنا میں کوئی ڈراما لکھ رہا ہوں یا ڈراما کر رہا ہوں، یا کالم لکھ رہا ہوں یا سفرنامہ لکھ رہا ہوں یا ناول لکھ رہا ہوں، میں کسی چیز کو ہلکا نہیں لیتا۔ چونکہ کالم کو ایک دن کا ادب کہا جاتا ہے ان کو بھی میں اپنے ہی انداز سے لکھتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا آج کالم لکھنا ہے تو بس کالم لکھ دوں کوئی نا کوئی چیز ذہن میں آئے گی تو میں لکھوں گا ورنہ نہیں لیکن یہ ہے کہ اگر مجموعی

طور پر دیکھا جائے تو ناول challenging ہوتا ہے کیونکہ کالم بھی آپ نے lightly لکھنا ہوتا ہے، کسی ایک بندے پر یا کسی ایک واقعہ پر، سفر نامہ بھی کسی ایک مقام سے شروع ہو کر دوسرے مقام تک جاتا ہے۔ اس میں آپ کے پاس حقائق پہلے سے موجود ہیں۔ مگر ناول میں آپ کے پاس حقائق موجود نہیں ہوتے ہیں وہ خود تخلیق کرنے ہوتے ہیں۔

سوال 4: آپ کے کالموں میں اکثر سیاست دانوں کا جانوروں سے موازنہ کیا گیا، آخر وہ کون سی وجہ ہے کہ آپ نے ان کا موازنہ جانوروں سے کیا؟

جواب: میں سیاست پر بہت کم لکھتا ہوں۔ موازنہ میں سب کا نہیں کرتا۔ اکثر ہلکا انداز اپنایا جاتا ہے۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ وہاں پر ایک دفعہ اسلام آباد میں موجود تھا۔ سوروں کا ایک ریوڑ آیا اس میں سے ایک ایک دو صد ارتی ہاوس میں گھس گئے اور ایک دو میں pty میں گھس گئے۔ اس طرز کا لکھنے کا مقصد situational مزاح ہے۔

سوال 5: آمریت کے بارے میں آپ کا نقطہ نظر کیا ہے اور آپ کے ہاں باقی آمروں کی نسبت ضیاء الحق پر زیادہ تنقید ملتی ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ پورا ایک عہد ہے اس کے لیے بہت لمبا چوڑا سوال چاہیے کیونکہ کسی اور آمر نے پاکستان کی بنیاد کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا اس معاشرے کو ضیاء الحق نے نقصان پہنچایا ہے۔ میں اس کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہ بیس ہزار مامے جو آپ نے اکٹھے کر لیے ہیں جن کی وجہ سے یہاں ہیر و سن اور کلا شکوف کلچر متعارف ہوا۔ اس نے کہا یہ ہمارے بھائی ہیں ان کو یہاں آنے دو۔ کس سلسلے میں وہ جہاد میں شریک ہوا، سارے کہتے ہیں ہم تب بھی کہتے تھے یہ جہاد نہیں ہے۔ روس آیا ہے یہ ان کا معاملہ ہے۔ ان کو آپس میں نمٹنے دو کیونکہ ہمارے پاس ڈالر آنے تھے لہذا ہم نے اس ملک کو آگ میں دھکیل دیا۔ ہمارے لکھنے پڑھنے پر جو پابندیاں لگائی گئی۔ ۶۶ ہزار لوگوں کو کوڑے پر برسائے گئے، ۲۵ لوگوں کو پھانسی دی گئی کیونکہ وہ ضیاء الحق کے خلاف گئے۔ اس کے دور میں Religious card کھیلا گیا۔ ضیاء الحق کے بارے میں، میں نے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں اور مجموعی طور پر آمریت نے اس ملک کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور اب بھی پہنچایا جا رہا ہے۔

سوال 6: آپ نیوٹرل رہ کر سیاست پر لکھتے ہیں آخر اس کی یہ وجہ ہے آپ کے کالموں میں سیاسی پارٹی کی حمایت نہیں ملتی؟

جواب: سیاسی پارٹی کی حمایت کا مطلب یہ ہے۔ میں ایک زمانے میں بھٹو کے بارے میں نرم گوشہ رکھتا تھا۔ عمران خان نے مجھے گھر کھانے پر بلایا لیکن میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی میں نے کبھی نہیں کہا کہ میاں دے نعرے و جن

گئے، میں صرف اور صرف ان کے عمل کو دیکھتا ہوں۔ ظاہر ہے مجھے بھی بہت سی سیاسی جماعتوں کی پیش کش ہوئی لیکن میں یہ نہیں کر سکتا۔ ایک فیصلہ ہوا کہ کل آپ نے کہنا ہے، جی شہباز شریف نے دودھ کی نہریں بہادیں اور سڑکیں بنادیں، اُن کی تعریف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ میں یہ ہر گز نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر کسی نے لاہور کے لیے کام کیا۔ جیسے پرویز الہی نے ۱۱۲۲ متعارف کروائی۔ شہباز شریف نے سڑکیں بنائی میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں چنانچہ میری حمایت اس ملک کے ساتھ ہے اور میری حمایت اس کے ساتھ ہے جو اس ملک کی بہتری کے لیے کام کرتا ہے۔

سوال 7: امریکہ پاکستان تعلقات کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب: ہم شروع سے ہی سرنگوں ہیں۔ پہلی بار دعوت امریکہ سے بھی آئی تھی اور روس سے بھی آئی تھی اور وہ امریکہ تشریف لائے تھے۔ سیٹو اور سینو جیسے بدترین معاہدات جن کی پورے عرب دنیا نے مخالفت کی لیکن پاکستان نے امریکہ کا ساتھ دیا۔ امریکہ سے ہم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔ انڈیا کو امریکہ نے کہا آپ روس سے تجارت نہیں کر سکتے۔ بھارت نے جواب دیا کیوں نہیں کر سکتے اسی میں ہمارے ملک کی بہتری ہے۔ وہ اپنے مفادات کو اہمیت دیتے ہیں۔ امریکہ کے بغیر ہم گزارا نہیں کر سکتے کیوں کہ ہمارا ان پر انحصار ہے اور ہمارا کشکول سب کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔

سوال 8: صحافت ادب ہے یا پیشہ؟

جواب: صحافت بنیادی طور پر پیشہ ہے، اگر آپ مخلص ہیں تو یہ بہت مقدس پیشہ ہے۔

سوال 9: کیا صحافت اور سیاست کو کہا الگ رہنا چاہیے؟ ہمارے بہت سے صحافی حضرات اپنے پسندیدہ سیاست دانوں کی نااہلیوں کو بھی ان کی خصوصیات بنا کر ان کے حق میں بول رہے ہوتے ہیں بعد میں ان کی حمایت کے نتیجے میں وزارتیں مل رہی ہوتی ہیں۔ کہا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کے اس رویے کی وجہ سے آزاد صحافت متاثر ہوتی ہے؟

جواب: آزاد صحافت نہ صرف متاثر ہوتی ہے بلکہ متاثر ہو چکی ہے۔ اس کو ناسور لگا ہوا ہے۔ صحافت کی کوئی نیوٹرل حیثیت ہی رہی، ایسا کرنے والے صحافیوں کو بہت سے انعام و اکرام کے ساتھ نوازا جا چکا ہے۔

سوال 10: اخباری کالم کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: ایک تو اخبار ختم ہو رہا ہے۔ ساری معلومات اب انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں۔ ہم جو اولڈ فیشن لوگ ہیں جب تک ہمارے ہاتھ میں کتاب نہ آئے تو ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ اگر اخبار چلتا رہا تو کالم بھی چلتے رہیں گے otherwise

چونکہ سوشل میڈیا اتنا مضبوط ہو چکا ہے کہ سوشل میڈیا نے کالموں کی جگہ لے لی ہے۔ کالم ایک اظہار ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں ضرور survive کرے گا۔

سوال 11: ایک اچھے کالم نگار میں کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: ایک اچھے کالم نگار کو بے باک اور غیر جانب دار ہونا چاہیے جو بغیر کسی سیاسی یا طاقت ور طبقے کے اثر و رسوخ سے اپنے قلم کو استعمال کر سکے۔ سچ اور حق کو کھل کر بیان کر سکے۔

سوال 12: مستنصر ناول نگار، سفر نامہ نگار، کالم نگار یا افسانہ نگار کیا کہلانا پسند کریں گے؟

جواب: ہمارے ہاں زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ ایک ٹھپہ لگایا جاتا ہے۔ افسانہ نگار یا ناول نگار۔ مجھ پر آپ ٹھپہ نہیں لگا سکتی۔ میں بنیادی طور پر ایک لکھاری ہوں۔ that is all

## عنوان: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

محقق: ثناء ملک

انٹرویو: اشفاق احمد ورک

### سوالات:

آپ کی رائے میں

سوال ۱: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کے ارتقاء کے بارے میں رائے دیں۔

جواب: سیاست چونکہ ہمارے معاشرے کا حصہ ہے۔ ہم رہتے ہیں اور ہمیں سیاست کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم اگر آنکھیں بند بھی کر لیں تو ہمیں اُس کو برداشت کرنا ہو گا۔ ایک ادیب عام آدمی سے زیادہ حساس ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان چیزوں کو زیادہ محسوس کرتا ہے۔ وہ سیاست سے باہر رہ نہیں سکتا وہ شاعری بھی کرے گا تو کسی نہ کسی شعر میں کوئی ناکوئی نظم اور اگر وہ کوئی افسانہ لکھتا ہے تو اس میں بھی سیاست کا اثر دکھائی دے گا۔ ایک ادیب آنکھیں بند کر ہی نہیں سکتا بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا عکاس ادیب ہوتا ہے تو یہ غلط نہ ہو گا۔ مورخ جھوٹ بول سکتا ہے، سیاست جھوٹ بول سکتی ہے لیکن ایک حقیقی ادیب کا قلم جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اگر ہمیں تحریک پاکستان کی صحیح تاریخ دیکھنی ہے تو ہمیں غالباً اقبال اور قائد اعظم کی مکتوب نگاری میں ملے گی۔ اگر ۱۸۵۷ء کے حالات جاننے ہیں تو غالب کے خطوط میں ملیں گے۔ ۱۹۴۷ء کے حالات و واقعات منٹو کے افسانوں، قراۃ العین اور عبداللہ حسین کے ناولوں میں ملیں گے۔ مورخ کا کسی نہ کسی کے ساتھ مفاد وابستہ ہو سکتا ہے مگر ادیب کو مفاد نہیں ہوتا۔ مستنصر حسین تارڑ ایک ادیب ہیں۔ ظاہر ہیں وہ چیزوں کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ ان کی سازی زندگی تقریباً لاہور میں گزری اور لاہور سیاست کا گڑھ ہے۔ جتنی بڑی تحریکیں چلی جتنے بڑے لیڈر سامنے آئے ان کا زیادہ تر علاقہ لاہور ہے۔ تو اس لیے اس حوالے سے یہ اہم ہے۔ تارڑ صاحب کسی سیاسی جماعت کے ساتھ منسلک نہیں ہوتے۔ جب کسی سیاسی جماعت کو ایک ادیب جو اُن کر لیتا ہے تو وہ غیر جانبدار نہیں رہتا۔ تارڑ صاحب نے سچ بات کی ہے بے شک ان کی بات کا کسی بھی سیاسی جماعت کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جس جس نے اس ملک کے ساتھ زیادتی کی تارڑ صاحب نے دو ٹوک الفاظ میں اس کا نوٹس بھی لیا اور اس کو اپنی تحریروں میں

بیان بھی کیا۔ سیاست ان کا موضوع نہیں ہے مگر میں نے آپ کو بتایا نادریا میں رہ کر سوکھا نہیں نکلا جاسکتا۔ سیاست بھی ایک دریا ہے جو ہمارے سامنے بہہ رہا ہے۔ کالم کرنٹ ایشوز پر ہوتا ہے اور کالم نگار ان کرنٹ ایشوز پر لازمی بات کرتا ہے۔ اخبار کی یہ ڈیمانڈ ہوتی ہے تو سیاسی اور سماجی حالات میں اس پر بات کریں اور کالم نگار کی حیثیت سے اس کو کرنا پڑتی ہیں اور تارڑ صاحب نے بھی اپنے کالموں میں سیاسی اور سماجی حالات کو شروع سے لے کر آج تک وہ بیان کرتے آئے ہیں۔ تارڑ صاحب نے بڑی غیر جانب داری کے ساتھ سیاست کو دیکھا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ رنگارنگ شخصیت ہیں انھوں نے تقریباً ہر موضوع کو اپنے قلم کے اندر سمیٹا۔ سیاست ان پر اثر انداز بھی ہوئی ہے اور انھوں نے سیاست پر لکھا بھی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا سیاسی سماجی منظر نامہ بدلتا گیا ویسے ہی تارڑ صاحب کا شعوری ارتقا ان کے کالموں میں سامنے آتا رہا۔

**سوال ۲:- مستنصر حسین تارڑ کے سیاسی و سماجی کالموں کا پس منظر یا محرک کیا ہے؟**

جواب: جب سیاست میں تبدیلی آتی ہے یا فیصلے ہوتے ہیں۔ اس میں ایک عام آدمی بھی متاثر ہوتا ہے۔ ہم اس طبقے میں رہ رہے ہیں۔ ابھی جو تبدیلی آئی ہے۔ اُس کے اثرات ہم سب پر ہوئے ہیں۔ ایک معاشرے میں جب ہم رہتے ہیں یہاں ہر بندہ متاثر ہوتا ہے۔ ملک میں موجودہ جو سیاسی حالات ہیں۔ ان حالات میں ملک suffer کر رہا ہے۔ ملک کے suffer کرنے کے ساتھ ساتھ ہر بندہ suffer کرتا ہے۔ جب ایک عام بندہ ان چیزوں کو اتنا محسوس کرتا ہے جبکہ ایک ادیب جو حساس بھی ہے جس کا کام ہی حق اور سچ کی بات کرنا ہے یا برے کو برا کہنا ہے اور اچھے کو اچھا کہنا ہے۔ وہ کیسے اس سے دور رہ سکتا ہے۔ اس لیے ان کے موضوعات کرنٹ ایشوز یا حالات حاضرہ سے ہیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں حالات حاضرہ ماضی میں جا ہی نہیں رہے ہیں۔ ہمارے سماج کے جو حالات و واقعات سیاسی اور سماجی طور پر بدلتے ہیں۔ تارڑ صاحب کے کالموں کا پس منظر اور ان کے محرکات بدلتا ہوا منظر نامہ ہے۔ جب ایک سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے تو اس سے سب متاثر ہوتے ہیں۔ ایک ادیب کیسے متاثر نہیں ہو سکتا۔ مستنصر حسین تارڑ حالات حاضرہ پر بات کرتے ہیں اور بدلتے ہوئے سیاسی حالات تارڑ صاحب کے سیاسی کالموں کے عناصر بنتے ہیں۔

**سوال ۳:- مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کے امتیازات کون کون سے ہیں؟**

جواب: مستنصر حسین تارڑ غیر جانبدار آدمی ہیں کسی بھی پارٹی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ تارڑ صاحب کے ہاں گلے میں کوئی طوق نہیں ہے اور نہ وہ کسی کی حمایت میں اپنے ذاتی فائدے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں

وہی لکھتے ہیں۔ تارڑ صاحب کے شعور کی اور ان کے قلم کی یہ انفرادیت ہے وہ حقیقت بیان کرتے ہیں جس کو وہ اچھا سمجھتے ہیں اس کو وہ اچھا لکھتے ہیں اور جس کو وہ برا سمجھتے ہیں وہ اس کو برا لکھتے ہیں۔ سماجی شعور کے حوالے سے تارڑ صاحب کے ہاں سماجی شعور کا پس منظر دیہات اور شہر دونوں کا ہے۔ ”خس و خاشاک زمانے“ میں اس گاؤں کے کلچر کو paint کیا۔ اس کی کہانی تو وہ 11/9 تک لے کر آئے۔ تارڑ صاحب کا دیہات اور شہر رویوں کا مشاہدہ زبردست ہے۔ انھوں نے زندگی دیہات میں بھی بسر کی اور شہر میں بھی بسر کی۔ تارڑ صاحب ایک سیاح بھی ہیں وہ ناصرف پاکستان سے باہر گئے انھوں نے پاکستان کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کو بڑے قریب سے دیکھا۔ لکھنے کا انداز بھی اپنا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں اوروں کے ساتھ پنجابی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ منفی پہلو لکھتا ہے۔ تارڑ صاحب اپنی تحریروں میں مختلف فلیور لاتے ہیں۔ بعض چیزیں جو ہمیں پسند نہیں آتی وہ منفی لگتی ہیں مستنصر حسین تارڑ منفی اور مثبت دونوں پہلو کو بیان کرتے ہیں۔ وہ مسائل کی نشان دہی کرتے ہیں معاشرے میں موجود خرابیوں پر طنز کرتے ہیں وہ سیاحت کے حوالے سے پاکستان کے شمالی علاقہ جات کو نمایاں کرتے ہیں۔

## عنوان: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سیاسی و سماجی شعور کا تجزیاتی مطالعہ

انٹرویو: ڈاکٹر غفور شاہ قاسم

محقق: ثناء ملک

### سوالات:

سوال: تارڑ کے کالموں میں سیاسی شعور کے ارتقاء کے بارے میں بتائے۔

جواب: مستنصر حسین تارڑ کی تحریروں میں ناول، افسانوں اور کالموں میں بھی اُن کا سیاسی شعور ملتا ہے۔ سیاسی شعور اُن کی ہر تحریر میں موجود ہے کیونکہ نظری طور پر وہ سیاسیات، معاشیات اور تاریخ کے طالب علم ہیں۔ یعنی تاریخ کے بارے میں وہ جان کاری رکھتے ہیں۔ عمرانیات پڑھتے ہیں۔ نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سیاسی شعور ”راکھ“، ”بہاؤ“، خس و خاشاک زمانے“ میں سیاسی شعور ملے گا۔ کالموں میں بہت سے ایسے کالم ہیں جن میں سیاسی بات کو ایک خاص زاویے سے دیکھا گیا۔ وہ اپنے کالموں میں غیر جانبدار آدمی ہیں۔ کسی سیاسی پارٹی یا سیاسی لوگوں کے ساتھ کوئی خاص وابستگی نہیں۔ وہ اپنی کمنٹ کے آدمی ہیں وہ اس کے مطابق لکھتے ہیں ان کا مقصد نہ کسی کو خوش کرنا ہے نہ کسی کو ناراض کرنا ہے اور نہ ہی اُن کی کالم نگاری ایسی ہے جس سے وہ فائدہ اٹھانا چاہ رہے ہوں، یہ اُن ایک ذریعہ معاش ہے۔ مستنصر حسین تارڑ ہر دور کے طالب ہیں۔ اُن کے کالموں میں روح عصر نظر آتی ہے۔ شروع میں ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے تھے۔ زیادہ سنجیدہ نہیں لیتے تھے بعد میں جتنا جتنا فکری ارتقاء ہوا اُن کی تحریر میں بھی وسعت آئی اور نئے نئے موضوعات آتے گئے اور پھر کسی نہ کسی علامتی انداز اختیار کیا جانوروں کا پرندوں کا، الو ہمارے بھائی ہیں، گدھے ہمارے بھائی ہیں اس طرح کے عنوانات لیے۔ علامتی انداز کے ذریعے بڑی گہری مزیت کی باتیں کی ہیں جیسے جیسے وقت گزرتا گیا مختلف واقعات سماج میں رونما ہوئے تارڑ صاحب نے ان واقعات پر قلم اٹھایا جس کے ذریعے ان کا شعوری ارتقاء سامنے آتا رہا۔ وہ دو ٹوک انداز میں بات کرتے ہیں وہ سر زمین وطن سے بہت محبت کرتے ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ آمریت کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ وہ جمہوری ذہن کے آدمی ہیں۔ وہ آزادی سے سوچتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو کسی خانے میں بند نہیں رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعہ میں وسعت نظری اور وسعت قلبی ہے۔ ان کے ہاں ہمیں تنگ نظری کہیں پر بھی نظر نہیں آتی ہے۔

**سوال: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں کا پس منظر یا محرک کیا تھے؟**

جواب: پاکستان تاریخ کے جن مراحل سے گزرا وہ ان کی نگاہ میں ہے۔ جتنے بھی سیاسی واقعات ہوتے ہیں وہ ان کے کالموں کے پس منظر بنتے ہیں۔ وہ براہ راست بات تو نہیں کرتے لیکن ان کے کالموں کے موضوعات انہیں حالات و واقعات سے آتے ہیں اور بدلتے ہوئے سیاسی نشیب و فراز ان کے سیاسی کالموں کا پس منظر بنتے ہیں۔

**سوال 3: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں ان کے شعور کی انفرادیت کیا ہے؟**

جواب: سب سے پہلے ان کی سوچ حب الوطنی پر مشتمل ہے۔ وہ حب الوطنی پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتے۔ اس کے بعد ان کے ہاں لفظیات کا چناؤ بہت ہی شاندار اور منفرد ہے۔ وہ آپ کی ڈکشن ہیں، آپ کی لغات میں اضافہ کرتے ہیں۔ جہاں پنجابی زبان کی ضرورت ہو تو وہ استعمال کرتے ہیں۔

**سوال 4: مستنصر حسین تارڑ کے کالموں میں سماجی شعور کا ارتقا بیان کریں۔**

جواب: ہمارے معاشرے میں جو بھی ہو رہا ہے، اس پر مستنصر حسین تارڑ کا گہرا مطالعہ ہے۔ وہ اس پر بڑی نظر رکھتے ہیں۔ اس پر ان کا جو رد عمل ہے وہ ایک ادیب اور بڑے لکھاری کا رد عمل ہے۔ عالمی معاشرے پر بھی ان کی نگاہ ہے۔ ”بہاؤ“ اور ”خس و خاشاک زمانے“ میں بھی ان کا سماجی شعور سامنے آتا ہے۔ ہم اگر کالموں کو دیکھیں تو بہت سے کالم میں ”تارڑ نامہ“ کے نام سے جو چھپ چکے ہیں۔ ان کالموں میں وہ سماج کی بات کرتے ہیں۔ سماج میں موجود مسائل کی اپنے کالموں میں نشان دہی کرتے ہیں۔

**سوال 5: سماجی شعور کے امتیازات کون سے ہیں؟**

جواب: سرزمین وطن سے ان کی کمٹمنٹ مکمل ہے یعنی کہیں کالم نگار ایسے ہیں جو وقت کے ساتھ بدل جاتے ہیں۔ ان کا قلم کسی اور کے ہاتھ میں ہوتا ہے، اپنے مفادات کے لیے وہ بدل جاتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کے شعور کی یہ انفرادیت ہے کہ وہ مفادات سے ماورا نظر آتے ہیں۔ شروع سے لے کر آخر تک ان کا قلم کبھی بکا نہیں ہے، جو بات سرزمین وطن کے خلاف محسوس کی وہ تارڑ صاحب نے غلط جانی اور اس پر قلم اٹھایا۔

## ضمیمہ - ۴

### کالموں کی فہرست

|                                    |
|------------------------------------|
| پاگلوں کو پکڑنے کا صحیح طریقہ      |
| ہم سب ڈوڈو ہیں                     |
| آنٹیاں ہی آنٹیاں                   |
| اچھو شیخ                           |
| خون ناحق کی گری اور گلوبل وار منگ  |
| جو درخت لگانا بھول گئے             |
| غریبوں سے ہمدردی کرنے والے لوگ     |
| دور سے لگتے تھے گدھے، گدھے ہی نکلے |
| بچوں کا قتل جائز ہے                |
| کیا ہم تانگے ہیں                   |
| جھاڑو چور اور ایک ہری شاخ          |
| ٹوبہ ٹیک سنگھ سے سوئٹزر لینڈ تک    |
| چوروں کے دل دھک دھک کیوں نہیں کرتے |
| لنگوری کالم                        |
| دہشت گردوں کی سیر                  |
| سانحہ پشاور                        |
| بونی بے ایمان                      |
| گڈ مارنگ سر عید مبارک              |

|                                                    |
|----------------------------------------------------|
| آدھے سمانوں کا ملک                                 |
| پاکستان کا قومی جانور بھینس، گدھ یا اونٹ           |
| K.F.C                                              |
| روزوں میں ایسا ہی ہوتا ہے                          |
| ماڈل ٹاون دھماکے کی صبح اور پرندے                  |
| عوام کی گائے اور خدا ترس حکومت                     |
| خالی خبروں میں خواب دفن ہیں                        |
| آل پاکستان گدھا کانفرنس                            |
| یہ مغرب زدہ لوگ                                    |
| بیگمات اور سیلاب                                   |
| مجھے ایک جھینگریا ہے                               |
| کرکٹ کی ٹرائن باقی کھیلوں کو کھائی                 |
| موٹر سائیکل چلانے والی ڈولفن مچھلیاں۔              |
| غم کے دروازے والدین کے جسموں پر ہی بند ہو جاتے ہیں |
| گدھے ہمارے بھائی ہیں                               |
| روم جل رہا ہے                                      |
| الو بڑھا چو ہے مکا و مہم                           |
| آئنیاں ہی آئنیاں                                   |
| دھند میں بیئر پکڑے جاسکتے ہیں                      |
| یہ خون کی مہک ہے یالب یار کی خوشبو                 |
| تو جونا و اقف آداب شہنشاہی تھی                     |

|                                           |
|-------------------------------------------|
| احتجاج ایک سعی لاحاصل                     |
| اچھو شیخ کی داستان                        |
| مجھے ہجرے پسند ہیں                        |
| خوش رہنے والے لوگ                         |
| ہم خرگوش ہی اس ملک کے لیے گریہ کرتے ہیں   |
| افغانستان کتنا پیار ملک تھا               |
| چچا سام کے نام ایک اور خط                 |
| ایک معیاری بے عزتی اور کابل میں چیخی عورت |
| حقیر لوگ اور خفیہ حکومت                   |
| فینسی ڈریس                                |
| فلسطینی تماشا                             |
| تین عجیب دیس                              |
| جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا        |
| مہک اب کے کمالات اور حسن کے معیار         |
| کاریز کی اندھی مچھلیاں                    |
| پاکستان کی پہچان                          |
| پاگل ای وئے                               |
| ایدھی صاحب اندھیرے میں روشن چراغ          |